مولانا جلال الدّین رومی

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

Marfat.com

Marfat.com

Pe - 2403
3

مولانا جلال الدین رومی

(احوال و افکار)

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

Marfat.com

297692
ر
87 قم

۷۷۲۱۱

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-299-4

کتاب	:	مولانا جلال الدین رومیؒ
مصنف	:	ڈاکٹر محمود الرحمٰن
موسم اشاعت	:	2008
مطبع	:	ورڈ میٹ، اسلام آباد
قیمت	:	200.00روپے

دوست پبلی کیشنز پلاٹ110، سٹریٹ15، I-9/2 ، پوسٹ بکس نمبر2958، اسلام آباد
فون: 051-4102784-5 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

Marfat.com

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوه ها تعمیر کرد

(علامہ اقبال)

Marfat.com

جلیل القدر مصنّف اور شاعرِ بے بدل

شیخ فریدالدین عطارؒ

کے نام!

ہفتِ شہرِ عشق را عطّار گشت
ماہنوز اندر خمِ یک کوچہ ایم[1]

(مولانا رومی)

---

1 اہلِ معرفت کا کیسا دلنشین فیضان ہے کہ حضرت عطارؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ''تذکرۃ الاولیاء'' کے پورے متن کو ''ذکرِ جمیل'' کے عنوان سے سلیس اُردو میں تحریر کرنے سے فارغ ہوا تھا کہ نابغۂ روزگار رومیؒ پر یہ کتاب لکھنے کیلئے آمادہ کر دیا گیا۔

Marfat.com

ترتیب

تقدیم	9
حیاتِ رومی : بہ یک نظر	13
نذرِ رومی	15
خاندانی پس منظر	17
نام ونسب، ولادت وبلوغت	25
دعائے عطارؒ	31
تعلیم وتربیت	37
درس وتدریس	43
قُربِ تبریزی	48
انقلابِ حیات	55
بہ حیثیت صوفیٔ باصفا	65
بہ حیثیت شاعرِ ہمہ رنگ	79
مثنویٔ معنوی : ایک جائزہ	92

Marfat.com

اقبال، مسجد قرطبہ اور مولانائے روم	108
قلم کاروں کا خراج عقیدت	116
انتخاب کلام	127
اختتامیہ	201
کتابیات	207

Marfat.com

تقدیم

دوسری صدی ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے۔ سرزمینِ بلخ کے عظیم شہنشاہ اپنے عالیشان محل میں گہری نیند سو رہے ہیں۔ باوردی دربان تیر و تفنگ اور نیزہ و سناں سے لیس پہرے پر مامور ہیں۔ چور اُچکے تو کجا، چڑیا بھی پَر نہیں مار سکتی۔ معاً چھت پر کسی کے چلنے کی چاپ سنائی دی۔ مذکورہ ظلِ الٰہی فوراً خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے اور بہ آوازِ بلند پوچھا: ''کون ہے؟''

''تمہارا دوست ہوں۔ میرا اونٹ گم ہو گیا ہے اور میں اسے تمہاری چھت پر تلاش کر رہا ہوں۔''

''بے وقوف آدمی! چھت پر اور اونٹ؟'' بادشاہِ بلخ نے تلخ آمیز انداز میں کہا۔

اوپر سے فوراً ہی جواب آیا: ''اے بے خبر! اس ریشمی لباس اور سونے کے تخت پر خدا کی تلاش؟''

اس جواب نے ظلِ الٰہی کو حواس باختہ کر دیا۔ ایک انجانے خوف کی لہر رگ رگ میں سما گئی۔ کروٹ بدل بدل کر رات کٹی۔ صبح ہوئی تو شاہ بلخ حسبِ معمول دربارِ عالیشان میں پہنچے۔

پورا دربار اسلحہ بردار سپاہیوں سے اٹا پڑا تھا۔ خنجر و سناں سے لیس افسرانِ حکومت اپنی اپنی جگہ ایستادہ تھے۔ معاً ایک اجنبی بھرے دربار میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے جلال اور رعب پیکر سے سارے ہی سپاہی دم بخود ہو کر رہ گئے۔ کسی میں اس انجانے آدمی کا راستہ روکنے کی ہمت نہ تھی۔ سب کی

زبانیں گنگ ہوکر رہ گئی تھیں۔خود بادشاہ بھی حیرت واستعجاب کے عالم میں نووارد کو دیکھ رہے تھے۔

آنے والا سیدھا تختِ طاؤس کی جانب بڑھا اور ٹھیک بادشاہ کے روبرو کھڑا ہو گیا۔بادشاہ نے دریافت کیا: ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' اس نووارد نے جواب دیا: ''میں ابھی ابھی اس کارواں سرائے میں اترا ہوں۔''

''تم پاگل ہو گئے ہو۔یہ کارواں سرائے نہیں ہے۔یہ میرا محل ہے۔'' تخت پر جلوہ گر بادشاہ نے آنے والے کو تنبیہ کے انداز میں کہا۔

''تم سے پہلے اس محل کا مالک کون تھا؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''میرے والد تھے۔'' بادشاہ نے کہا۔

''ان سے پہلے؟''

''میرے دادا تھے!''

''اور ان سے پہلے؟''

''میرے پردادا تھے۔''

''اور ان سے پہلے؟''

''میرے فلاں فلاں اجداد تھے۔''

''یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''وہ سب وفات پا کر دنیا سے چلے گئے۔'' تخت پر جلوہ افروز بادشاہ نے جواب دیا۔

''تو پھر یہ کارواں سرائے نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک یہاں آتا ہے اور دوسرا چلا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اجنبی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا[1]۔

رات کے واقعہ سے سراسیمہ، پہرہ داروں کے حصار کو توڑ کر دربار میں آنے والے شخص کی گفتگو سے ششدر اور اس کے اچانک غائب ہو جانے پر متحیّر بادشاہ کے رگ وپے میں آتشِ عشق بھڑک اٹھی۔ اپنی عظیم الشان سلطنت پر لات ماری اور درویشی اختیار کر لی۔ان کا نامِ نامی تھا ابراہیم بن ادہم بلخیؒ۔

مذکورہ واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے ٹھیک پانچ سو سال بعد اسی سرزمینِ بلخ سے تعلق رکھنے والی

---

1 یہ خواجہ خضر علیہ السلام تھے جو ازاں بعد آپ کے استاد بنے۔

Marfat.com

اورانہی حضرت ابراہیم بن ادہم بلخیؒ کے خاندان کی ایک مقتدر خاتون کے بطن سے پیدا ہونے والی ایک عظیم وجلیل شخصیت قونیہ میں اپنے آراستہ و پیراستہ دیوان خانے میں تشریف فرما ہے۔ فرش قیمتی قالینوں اور ریشمی غلاف والے گاؤ تکیوں سے مزین ہے۔ سامنے ہی خوبصورت سا حوض ہے جس میں ایک فوارہ نصب ہے۔ پانی کی ہلکی ہلکی مرتعش دھاریاں رنگ ونور کا سماں پیش کر رہی ہیں۔ ایک طرف نہایت قرینے سے مجلد کتابیں اور قلمی مسودّے رکھے ہوئے ہیں۔ طلبا نہایت مؤدب ہوکر میر محفل کی گفتگو سننے میں منہمک ہیں۔ چند دانشورانِ وقت بھی شریک بزم ہیں اور خود صاحبِ محفل نہایت منقش لباس زیب تن کئے محوِ گفتار ہیں۔ ان کی باتوں میں گُلوں کی خوشبو بھی ہے، جملوں میں حکمت ودانش کے موتی بھی ہیں اور پیرایۂ بیان میں علم وادب کی آمیزش بھی!

معاً اس بزمِ دانشوراں اور محفلِ علم وحکمت میں ایک ایسا شخص داخل ہوتا ہے جس کا لباس بوسیدہ بھی ہے اور بدبُودار بھی! جس کے سر کے بال بے طرح الجھے ہوئے ہیں۔ جس کی آنکھوں میں کیچڑ ہے اور ناک سے رطوبت بھی خارج ہو رہی ہے۔ وہ ننگے پاؤں ہے جو کیچڑ اور گرد وغبار سے لتھڑے ہوئے ہیں..... وہ دندناتا ہوا آیا اور صاف ستھرے فرش پر نہایت بے پروائی سے بیٹھ گیا۔

صاحبِ محفل کو اس آنے والے شخص کی ادا ایک آنکھ نہ بھائی۔ سوچا یہ دیوانہ بزم علم وحکمت میں کہاں آ گیا۔ لیکن خاموش رہے۔ معاً نووارد نے ایک مجلّد کتاب اپنے گندے اور غلیظ ہاتھوں سے اٹھائی۔ میر محفل تو اس شخص کی آمد سے پہلے ہی دل گرفتہ تھے۔ کتاب اٹھاتے دیکھا تو نہایت تُرش لہجے میں کہا:

''یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

آنے والے نے چُپ چاپ یہ کتاب رکھ دی۔ عین اسی لمحے اندر سے ایک ملازمہ آئی اور اس نے سرگوشی میں میر محفل سے کچھ کہا۔ وہ فوراً اٹھ کر اندرونِ خانہ جانے لگے۔ دیگر مہمان حضرات اور طلبا بھی اٹھ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ گڈری پوش شخص جوں کے توں بیٹھا رہا۔

جیسے ہی صاحبِ خانہ اندرونِ حویلی گئے، نووارد نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ساری کتابیں، سارے مسودے، سارے مخطوطے اٹھا اٹھا کر حوض بُرد کر دیا۔ سطحِ آب پر گلگوں سماں نظر آنے لگا۔ عین اسی وقت صاحب خانہ باہر تشریف لائے۔ نظر حوض پر پڑی۔ دیکھا ہر چیز سطحِ آب پر تیر رہی ہے۔ پھر جو مڑ کر دیکھا

Marfat.com

تو فرشِ قالین پر ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ برافروختہ ہو کر کہنے لگے:

''اے شخص! تُو نے یہ کیا کیا؟ میری ساری زندگی کا اثاثہ پانی میں ڈال کر تلف کر دیا۔''

نو وارد نے غصے بھری یہ باتیں سنیں اور ہاتھ بڑھا کر حوض سے چیزیں نکالنی شروع کر دیں۔

''اب کیا فائدہ ہے نکالنے کا۔ اوراق سلامت بھی رہے ہونگے۔ سیاہی پھیل گئی ہو گی۔ جِلدوں کا ستیاناس ہو گیا ہوگا۔'' صاحب محفل حزنیہ انداز میں بولے۔

''خود دیکھ لو۔'' نو وارد نے نیم باز آنکھوں اور زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ جلے بھُنے میزبان کو کہا اور جب صاحبِ علم و دانش نے حوض سے نکالی گئی کتابوں، مخطوطوں اور کاغذوں کو دیکھا اور ہر چیز کو صحیح سالم پایا تو محوِ حیرت ہو کر کہنے لگے:

''اے شخص! یہ سب کیا ہے؟''

''یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔'' یہ کہا اور اُٹھ کر تیزی سے یہ جا وہ جا۔ وہ صاحبِ علم و دانش، پیکر شعور و بصیرت اور مجسّم فکر و فلسفہ اسی گدڑی نشیں، الجھے بال والے، آنکھوں میں بھری کیچڑ والے، گرد آلود پاؤں والے شخص کے پیچھے ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے، بگ ٹٹ اور بے تحاشا!

بہت دُور جا کر ایک گھنے جنگل میں عجیب شان کی کرامت دکھانے والے اس شخص کو پکڑا اور اُن کے گرد آلود، کیچڑ سے لت پت پاؤں پر اپنا سرِ نیاز خم کر دیا۔

وقت کے ایک عظیم درویش اور مجذوبِ دوراں حضرت شمس تبریزؒ کے قدم مبارک پر جبیں سائی کرنے والے اور بلخ کے سابق شہنشاہ کے نواسے جنہوں نے آناً فاناً علم و حکمت کے محراب و منبر سے علیحدگی اختیار کر لی اور خرقۂ درویشی پہن کر راہ سلوک و معرفت کی شاہراہِ وسیع و عریض پر چل پڑے..... حضرت جلال الدین رومیؒ تھے اور یہ کتاب انہی کے احوال و افکار کے بارے میں لکھی گئی ہے اس آرزو کے ساتھ:

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگِ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

ڈاکٹر محمود الرحمٰن
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد
11 فروری 2008ء

حیاتِ رومی..... بہ یک نظر

1207ء: بمقام بلخ پیدا ہوئے۔

1212ء: اپنے والد اور اہلِ خاندان کے ساتھ ہجرت کی اور سمرقند آئے۔

1213ء: رومیؔ اپنے والد اور خاندان کے ساتھ بلخ واپس گئے۔

1220ء: پھر، اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے نیشاپور آئے۔ اسی سال وہاں سے بغداد آ گئے۔

1228ء: مولانا اپنے والد کے ہمراہ حجاز اور شام کا سفر کرتے ہوئے لارندہ تشریف لائے۔ اسی سال لالائی سمرقندی کی بیٹی گوہر خاتون سے مولانا رومیؔ کی شادی انجام پائی۔

1229ء: مولانا رومی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سلطان ولد رکھا گیا۔ آگے چل کر یہ صاحبزادے اپنی مثنوی ''ولدنامہ'' کی بدولت مشہور و معروف ہوئے۔ اسی سال آپ قونیہ آئے اور مستقلاً سکونت پذیر ہوئے۔

1231ء: مولانا رومؔ کے والد شیخ بہاءالدین ولد کی وفات واقع ہوئی اور آپ ان کے جانشین بنے۔

1233ء: مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مولانائے روم حلب روانہ ہوئے۔ پھر وہاں سے دمشق آئے۔

1240ء: قونیہ واپس آئے۔ اسی سال آپ کے اتالیق برہان الدین محقق وفات پا گئے۔

1244ء: شمس تبریز قونیہ آئے اور مولانا رومؔی سے ملاقات ہوئی۔

1246ء: شمس تبریز لاپتہ ہو گئے۔ مرشد کی گم شدگی کے غم میں تیس ہزار اشعار موزوں کئے اور اس دیوان کو شمس تبریز کے نام سے منسوب کیا۔

1247ء: رومی کے بیٹے سلطان ولد شمس تبریز کو شام سے واپس قونیہ لائے۔

1248ء: شمس تبریز ہمیشہ کے لئے قونیہ سے غائب ہو گئے۔ رومی کا اضطراب ناقابل برداشت ہو گیا۔ موسیقی، سماع اور رقص میں محو ہو گئے۔

1250ء: اسی عالم میں صلاح الدین زرکوب سے ملاقات ہوئی اور مولانائے روم اس کے گرویدہ ہو گئے اور کہا:

یکے گنجے پدید آمد ازیں دکّانِ زرکوبی
زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی، زہے خوبی

1261ء: صلاح الدین زرکوبی کی وفات واقع ہوئی تو مولانا نے اپنے مرید حسام الدین چلپی کو اپنا ہمدم و ہم راز بنا لیا۔ اسی سال چلپی کی گزارش کے پیش نظر رومی نے مثنوی لکھنے کا آغاز کیا اور پہلا دفتر لکھا۔

1263ء: دو سال کے وقفے کے بعد دفتر دوم شروع ہوا۔

1273ء: مولانا نے بمقام قونیہ وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

Marfat.com

نذرِ رومی

وہ جلال الدین رومی

مولویٔ معنوی

وہ فروزاں مہر و ماہِ آسمانِ فارسی

مثنوی اُن کی بقولِ حضرت جامؔی

ہے قرآں در زبان پہلوی!

وہ دعائے حضرت عطّار تھے

اہلِ عرفانِ جہاں کے ذی حشم سردار تھے

آشنائے رمزِ الفت، پیکرِ اسرار تھے

بے کراں دشتِ طریقت میں شعاعوں کے بلند مینار تھے!

علم و دانش کا وسیع و بے کنار و بے نہایت اک سمندر.....

مولویٔ معنوی!

بے مثال و لازوال و ارفع و اعلیٰ گہر.....

مولویٔ معنوی!
رحمتوں کا، شفقتوں کا اک تناور سا شجر.....
مولویٔ معنوی!
فکر و فن، فہم و فراست کی درخشاں رہ گزر.....
مولویٔ معنوی!
حُزن و یاس و رنج و غم کی ظلمتوں میں اک شرر.....
مولویٔ معنوی!

کشورِ شعر و سخن کے دائمی شاہِ جہاں
سرزمینِ مثنوی کے وہ منوّر آسماں
وہ جُنید و شبلی و ادہم کی راہوں کے نشاں
شمس تبریزی کے مسلک کے حقیقی ترجماں!

عشق کا گوہر فروزاں درجبینِ مولوی
عظمت و جاہ و جلالت ہم نشینِ مولوی
آسماں سے بھی بلند تر ہے زمینِ مولوی
شاعرِ مشرق سراپا خوشہ چینِ مولوی!

مانندِ رومی نہ گزرا ہے نہ گزرے گا کوئی
ایسا روشن تارا ابھرا ہے نہ ابھرے گا کوئی!

Marfat.com

خاندانی پس منظر

ماضیٔ بعید میں بلخ خراسان کا ایک ایسا مقام تھا جو شان وشکوہِ سلطنت کے لئے ہی مشہور نہ تھا، بلکہ تہذیب وتمدن، علم ودانش، فکر وفن اور مذہبی اقدار وروایات کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بھی خاصا معروف رہا تھا۔ یہی وہ دیار قدیم ہے جہاں دنیائے تصوف کے بطلِ جلیل حضرت شیخ ابراہیم بن ادہم زمانۂ بادشاہت میں اس طرح ایوانِ سلطنت میں تشریف فرما ہوتے تھے کہ پہرے دار سونے کی چالیس تلواریں اور اعصائے سلطنت لے کر آگے آگے خراماں ہوتے تھے اور اسی قدر سونے کی تلواریں اور اعصاء تھامے چوبدار پیچھے پیچھے چلتے تھے۔

لیکن جب، قضا وقدر نے انہیں بوریائے بوذرؓ پر متمکن ہونے کے لئے چن لیا تو جملہ جاہ وحشم، رعب داب، کروفر، حشمت وعظمت..... سارے ہی عوامل یک لخت کافور ہو گئے اور صوفیٔ باصفا بن کر موصوف نے وہ رتبۂ عظیم پایا کہ علوم اولیاء کی کلید کہلائے۔ اور اسی سرزمین سے شفیق بلخیؒ، ابوبکر وراقؒ، حاتم اصمؒ اور ابومحمد معرتشؒ جیسے اولیائے کامل اٹھے جنہوں نے اپنے وقت کے جنیدؒ وعطارؒ اور شبلیؒ وبایزیدؒ جیسے بلند مرتبت روحانی پیشواؤں کو متاثر کیا۔ بلخ کے یہ بوریا نشین بہت بڑے ماہر علوم تھے اور انہوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں الکندی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کے شاگرد رشید ابوزید بلخی نے جنم لیا اور

آگے چل کر جغرافیہ نویس کی حیثیت سے مشہور زمانہ ہوا۔ ساٹھ کتابوں کے اس بلخی مصنف کا شمار حکمائے اسلام میں کیا گیا ہے۔

یہی وہ شہر قدیم ہے جہاں عالیشان محلات تھے، سر بہ فلک عمارتیں تھیں، پُرشکوہ مساجد تھیں، وسیع وعریض مدرسے تھے، ہزارہا کتابوں پر مشتمل لائبریریاں تھیں۔ اقتصادی لحاظ سے یہ ایک ایسا دیار تھا جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ کاروبار عروج پر تھا۔ بازار متنوع سامان سے اٹے پڑے تھے۔ نامور مورخ المقدس کے بقول:

> ''دوسرے ایرانی شہروں کے مقابلے میں بلخ کی سڑکیں زیادہ چوڑی تھیں۔ اس کی مسجدیں خوبصورتی میں بے نظیر تھیں۔ اس کے گھروں کے صحن و دالان خراسان کے تمام شہروں کے صحنوں اور دالانوں سے زیادہ وسیع اور کشادہ تھے۔''

جغرافیائی، تاریخی، تمدنی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے بلخ کو جو فوقیت حاصل رہی ہے، وہ کسی اور علاقے کو کم ہی نصیب ہوئی ہے۔ ظاہر ہے، اتنے اوصاف کے حامل اس شہر بے مثال میں پیدا ہونے والی اور نشوونما پانے والی ہستیاں بھی ستودہ صفات ہوں گی۔ ان کا ہر عمل قابل رشک ٹھہرا ہوگا۔ ان کی ہر بات حکمت و دانش کا پرتو رہی ہوگی۔ ان کا قُرب تسکین وطمانیت کا موجب بنا ہوگا۔ ایسے رجال وابطال کے سائے میں انسانیت یقیناً بقعۂ نُور بنی ہوگی۔

﴿ ایسے ہی معزز ومنقش رجال وابطال میں پیر رومیؒ کے والد سلطان العلماء محمد بن حسین خطیبی المعروف بہ بہاء الدین ولد بھی تھے جو عموماً بہاولد کہلاتے تھے۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو پورے صوبۂ خراسان میں علم وفضل، حکمت ودانائی اور شریعت وطریقت کی سربلندی کے لیے مشہور ومعروف تھا اور نتیجتاً قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ وہ خانوادۂ بلخ تھا جس نے کثیر تعداد میں ایسے فضلاء اور فقہا پیدا کیے تھے جو اپنے جدّ اعلیٰ اور خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیروی کرتے ہوئے خراسان کے اس دُور افتادہ مقام میں دین اسلام کی ترویج واشاعت میں شب وروز منہمک رہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے سرزمینِ عرب میں جس دین متین کا حیات آگیں پیغام پیش فرمایا تھا، اسے ہزاروں میل دور..... دریائے جیحوں کے اردگرد آباد علاقوں میں مشتہر کرنے کا فریضہ یہی خاندانِ ذی وقار سرانجام دے رہا تھا۔﴾

Marfat.com

یہ وصفِ علم وحکمت محض بہاء الدین ولد تک ہی محدود مخصوص نہ تھا بلکہ اس خاندان کی سابقہ نسلوں کے لیے بھی باعثِ اعزاز رہا تھا۔ بہاء ولد کے آباواجداد قرنوں سے مسندِ علم وفضیلت پر متمکن تھے اور ایک عالم کو اپنے سرچشمۂ علم ودانش سے فیضیاب فرمارہے تھے۔ تشنگانِ طریقت اور طلبائے حقیقت بلند وبالا فصیلوں سے گھرے ہوئے اور آہنی دروازوں سے آراستہ اس شہرِ بے مثال میں آتے اور اجدادِ رومی کے آگے زانوئے ادب تہہ کر کے علم ودانش کے موتی رولتے۔

خود مولانائے روم کے دادا بزرگوار پورے دیارِ بلخ میں عزت وتعظیم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا نام نامی ابن احمد خطیبی تھا۔ علم وفضیلت میں انہیں نہایت وسیع وبسیط اور ارفع واعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ان کی دانشوری، علوم دینی میں کامل دستگاہ اور شعائرِ اسلامی پر مکمل عبور نے خراسان سے باہر تک کے علاقے میں شہرت وناموری کے علَم گاڑ دیئے تھے۔ نیشاپور جیسے دور دراز مقام کے رہنے والے رضی الدین نے جب احمد خطیبی کا شہرہ سنا تو پاپیادہ چل کر واردِ بلخ ہوئے اور مولانائے روم کے داداجان کی شاگردی اختیار کی..... اور اردگرد کے تشنگانِ علم کا پوچھنا ہی کیا۔ وہ ہر لمحہ اور ہر آن دولت کدۂ خطیبی پر حاضر ہو ہو کر اپنے سینہ ہائے تشنہ کو سیراب کرتے اور حبیب وداداں کی تزئین کا سامان بہم پہنچاتے۔

حضرتِ خطیبی ظاہری علوم کے ہی بحرِ مواج نہ تھے، روحانی اقدار وروایات کے علم بردار بھی تھے۔ چنانچہ دلوں کی کثافت دور کرنے اور روحانی بالیدگی کے حصول کے لیے بھی لوگ جوق در جوق درِ خطیبی پر آ آ کر فیضیاب ہوتے۔ علم وفضل میں یکتائے روزگار خطیبی کی قدر ومنزلت کا اندازہ اس امر سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مملکتِ خراسان کے جملہ علاقوں سے، چاہے وہ نزدیک ہوں یا دور، حصول فتویٰ کے لیے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل شہر بلخ کے انہی بزرگ ترین شخصیت کے پاس آیا کرتے تھے اور آپ کا جاری کردہ ہر فیصلہ اٹل گردانا جاتا تھا۔

قدر ومنزلت اور رفعت وعظمت کا یہ سلسلہ مولانائے روم کے دادا حضرت احمد خطیبی سے چلتا ہوا آپ کے والد گرامی شیخ بہاء الدین ولد تک پہنچا۔ دراصل وہی مسندِ خطیبی کے وارث ٹھہرے اور علم و حکمت، طریقت وشریعت اور فکر ودانش کے سرچشمے کو مسلسل جاری وساری رکھا۔ اس کی کیفیت کچھ یوں تھی کہ ہر روز صبح سے دوپہر تک علوم درسیہ کا سبق دیا کرتے تھے۔ بعد نماز ظہر اسرار ورموز اور حقیقت و

Marfat.com

معرفت کا درس دیتے۔ ہر دونشست میں سامعین کا ایک اژدہام ہوتا۔ گویا کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور ایک عالَم مولانا بہاولد کی گوہر فشانیوں سے متمتع ہوتا تھا۔

اس درسگاہ میں عوام الناس ہی شریک نہیں ہوتے تھے، اراکین حکومت بھی جوق در جوق آتے اور خطبات بہا سے فیضیاب ہوتے۔ حتیٰ کہ محمد خوارزم شاہ جو سریر آرائے سلطنت تھا، مولانا روم کے والد گرامی حضرت بہاء الدین ولد کا حلقہ بگوش تھا، آپ کی خدمت میں اکثر آیا کرتا اور فکر انگیز درس بہ انہماک سنتا۔

یہی وہ خاندانی پس منظر تھا جس میں دنیائے شعر وسخن کی جلیل القدر شخصیت یعنی مولانا جلال الدین رومی نے آنکھ کھولی، پلے بڑھے اور نشو ونما پائی۔ علم وعرفان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ان کے قدموں تلے بہہ رہا تھا۔ فکر ودانش کی عطر بیز ہوائیں ان کے مشام جاں کو مَس کر رہی تھیں۔ شعور و آگہی کے خزانے مولانائے روم کو ورثے میں مل چکے تھے۔ اردگرد کا ماحول تہذیب وادب کا عکاس تھا۔ خاندان کے جملہ افراد کا اٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا، ملنا ملانا، سب کچھ اخلاق کریمانہ کا مظہر تھا۔ یہی سارے عناصر ان کی شخصیت کے نکھار سنوار کا سامان ٹھہرے۔

پھر، والد کے ملاقاتیوں میں صاحبِ علم ودانش بھی تھے، افرادِ ذی مرتبت بھی! علمائے دین بھی تھے اور فضلائے عصر بھی! خود بادشاہ وقت کی آمد جہاں شاہی آداب واحترام کی ضامن تھی، وہاں انداز گفتگو اور طرز تخاطب کی داعی بھی تھی۔ ان لمحات میں ایک طرف شان وعظمتِ سلطنت ہویدا تھی تو دوسری جانب علم ودانش کا وقار اور حرف ومعنی کی عظمت اجاگر تھی۔ ان گوناگوں مناظر اور ایسے متنوع ماحول نے کم سن رومی کی کشتِ حیات کی آبیاری کی اور ایک چھتنار درخت بننے میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔

اس خانوادۂ بہاولد میں آنے والے بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ان کے چہرے کی لکیریں مختلف، ان کا طرزِ تخاطب جدا، ان کے ملنے کا انداز الگ! ان سبھوں کی نشست و برخاست غیر مماثل!..... یہ سب عوامل کم سن رومی کے معصوم ذہن کے نازک پردے پر منعکس ہوتے چلے گئے اور غیر شعور نے ان مشاہدات کو سنبھال سنبھال کر رکھا۔

بلخ میں گزارے ہوئے رومی کے یہ ابتدائی پانچ سال نفسیاتی طور پر حد درجہ اثر انگیز تھے۔ جو

Marfat.com

کچھ دیکھا، جو کچھ سنا، پردۂ شعور پر چپکتا چلا گیا..... اور جب 1212ء میں والد محترم کے ساتھ کم سن جلال نے سمرقند کا سفر اختیار کیا تو ان کی آنکھیں اردگرد کے ماحول سے چکا چوند ہو گئیں۔ شاہراہ کی دونوں جانب بلند و بالا کہسار، وادیوں میں سرسبز باغات، ہر جانب ہریالی، نوع بنوع کے اثمار اور ہری بھری کھیتیاں..... یہ دلکش مناظر رومی کے پردۂ ذہن پر ثبت ہوتے چلے گئے۔

پھر سمرقند جیسے تاریخی شہر میں اہل خاندان کے ساتھ رومی کا یک سالہ قیام ان کی معصوم معلومات میں اضافے کا سبب ٹھہرا۔ انہوں نے وہاں کے علماء و فضلا کی صحبت ہی نہیں دیکھی، منظر حشر ساماں بھی دیکھا تھا۔ خوارزم شاہ نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کو تاخت و تاراج کیا اور حملہ آور وہاں کے باشندوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ اسی یورش کے موقع پر ایک خوبرو لڑکی نے اللہ تعالیٰ سے اپنی حفاظت کی دعا مانگی تھی۔ چنانچہ حملہ آور کی بدنظری، تشدد اور بلاکت سے وہ بچی رہی۔

اپنی چھ سالہ عمر میں نوخیز رومی نے اپنی آنکھوں سے مذکورہ بالا خونیں حادثہ دیکھا تھا جو انہیں یاد رہا اور ان کی تقاریر کے مجموعے ''فیہ مافیہ'' میں قابل ذکر ٹھہرا اس جملے کے ساتھ:

> ''جو شخص خود کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے وہ تمام آفات سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ دربار خداوندی میں کسی کی دعا ضائع نہیں ہوتی۔''

ذرا غور کیجیے کہ چھ سال کی عمر، کم سنی کا زمانہ، ناتجربہ کاری کا دور، کچے ذہن کے سن و سال..... اور تجزیہ نگاری کی یہ قوت جو باقاعدہ ایک تاریخی حقیقت کی غماز ہے۔ یہ سارے خونچکاں مناظر رومی نے اپنے والد کے زیر سایہ ہی دیکھے۔ اور یہ بھی دیکھا کہ شیخ بہاء الدین ولد اس تباہی و بربادی پر کس قدر دل گرفتہ دکھائی دیتے تھے..... یقین کیجیے کہ حیاتِ رومی کا یہ ایسا خاندانی پس منظر ہے جس نے نوخیز جلال الدین میں تباہی و بربادی پر کڑھنے، عوام الناس کے قتل و غارت گری پر تاسف کرنے اور انسان کی بہبودی و بھلائی کے لیے مثبت اقدامات کرنے پر ابتدائی عمر میں ہی آمادہ کر دیا تھا۔ کیا یہ سب تجربات، مشاہدات اور واردات لوحِ دلِ رومی پر اس طرح ثبت نہیں ہوئے کہ آگے چل کر دیوان شمس تبریز کی صورت میں اور مثنویٔ معنوی کی شکل میں بروئے کار آئے۔

مجھے اس امر کا سخت افسوس ہے کہ کلام رومی کا تجزیہ کرنے والوں نے حیاتِ رومی اور اس کے خاندانی پس منظر کو قطعاً وقعت نہیں دی۔ کاش کوئی ماہر نفسیات مولانائے روم پر قلم اٹھاتا تو پھر

دنیائے دگر ہوتی۔

شیخ بہاء الدین ولد کچھ ہی عرصہ بعد اپنے بیٹے رومیؔ کو ساتھ لے کر واپس بلخ آ گئے۔ واپسی کا یہ سفر بھی ننھے ذہن کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا رہا۔ والد بلخ کے شاہی دربار کی سازشوں سے تنگ آ کر سمرقند گئے تھے کہ سکون و اطمینان کے ساتھ فرائض منصبی انجام دینے کا موقع میسر ہو گا...... مگر مشیت ایزدی کو یہ منظور نہ تھا۔ وہاں کشت و خون کا ماحول دیکھ کر وہ واپس اپنی جنم بھومی کی طرف لوٹے...... سمرقند کا یہ سفر شیخ بہاولد کے لیے یقیناً روح فرسا رہا ہو گا، لیکن ان کے کم سن بچے کے لیے آنے والی زندگی اور شروع ہونے والی سخن سنجی میں نہایت فعّال کردار ادا کرنے کا سبب بن گیا۔

اپنی جنم بھومی کی طرف ''یہ خاندانی'' واپسی رومی کے لیے مزید حزن و ملال کا باعث ٹھہری۔ ہر طرف خوف و ہراس کا عالم طاری تھا۔ اہالیان بلخ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ مغل فوج کا سالار، خان اعظم یعنی چنگیز خاں شہروں، بستیوں، قریوں اور دیہاتوں کو مسمار کرتا، ہر ایک مفتوحہ مقام پر مقتولین کی گردنوں کے مینار سجاتا ہوا صوبۂ خراسان کی جانب رواں دواں تھا۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ عزت و آبرو بچانے کا خیال مال و منال کے تحفظ پر فوقیت حاصل کر گیا تھا۔ پھر جان ہے تو جہان کا کلیہ حرز جاں بن چکا تھا۔

یہ لمحۂ دلخراش جہاں شیخ بہاء الدین ولدؔ کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا، وہاں دس گیارہ سالہ جلال الدین رومیؔ کے لیے کچھ کم باعثِ حزن و ملال نہ تھا۔ ابھی ابھی تو اس نوخیز لڑکے نے سمرقند میں قتل و غارت گری کا بازار دیکھا تھا، پابجولاں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی چیخ پکار سنی تھی، ہر طرف بہتے ہوئے انسانی لہو دیکھے تھے، خاکستر مکانات اور اُجڑے ہوئے باغات پر غم انگیز نگاہ ڈالی تھی...... اور اب خود اس نوجوان نابغے کا اپنا وطن بلخ ظالم و سفاک منگولوں کی خوں آشام تلواروں اور دندناتے ہوئے گھوڑوں کے نوکیلے فولادی سموں کی زد پر تھا۔

ایسے پُر آشوب حالات میں تیرہ سالہ رومی کو اپنے گھر والوں کے ہمراہ پھر رخت سفر باندھنا پڑا اور اس نوجوان کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ اب آگے ہی آگے جانا ہے، لوٹ کر نہیں آنا ہے۔ ممکن ہے بڑی عمر کے افرادِ خاندان اس دوسرے سفر پر اس درجہ مغموم و مضمحل نہ ہوئے ہوں کہ پختگیٔ عمر نے انہیں صبر و تحمل کی قوت ودیعت کر دی تھی...... لیکن اس نوجوان کے لیے یہ بات ہرگز قابل برداشت نہ تھی۔ وہ عام سا

Marfat.com

LL211

نوجوان نہ تھا۔ وہ ایک حساس دل کا مالک تھا۔ اس کا سینہ گداز تھا۔ اسے اپنے آباؤ اجداد کی دہلیز دل و جاں سے زیادہ پیاری تھی۔ وہ گلیاں چھوٹ رہی تھیں جہاں اس نے بچپن کے دن کھیل کود میں گزارے تھے۔ وہ چھتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہونے والی تھیں جن کے درمیان وہ چھلانگیں لگاتا تھا۔ وہ کھیت کھلیان، وہ باغات، وہ نہریں، وہ عالیشان عمارتیں، وہ سنہری مسجدیں اور وہ وسیع و عریض عیدگاہیں اب قصۂ پارینہ بننے والی تھیں۔

اسی بوجھل دل اور پُر اشک آنکھوں کے ساتھ جلال الدین رومی خاندان والوں کے ساتھ اس طرح بلخ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوئے کہ شعور کی لہروں پر غم انگیز تاثر متحرک تھا۔ یہ ایک ایسی کسک تھی جو تمام عمر اُن کے نہاں خانۂ دل پر شبخوں مارتی رہی۔ یادِ ماضی کا سوتہ کبھی بھی سینۂ رومیؔ میں خشک نہیں ہوا۔ اور یہی وہ دبی دبی چنگاری تھی، جب شعلۂ جوالہ بنی تو یہ تیرہ چودہ سالہ جوان آگے چل کر محض مولانا جلال الدین نہ تھا، بلکہ مولویٔ معنوی بھی تھا، ایک ضخیم ''دیوان'' کا شاعر اور ''ہست قرآں در زبانِ پہلوی'' کا خالق بھی تھا۔

جب قافلۂ بہاولد نیشاپور وارد ہوا تو اس دور کی عظیم و جلیل شخصیت، حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ بلخ سے آنے والے جید عالم اور معروف دینی رہنما شیخ بہاءالدین سے ملنے تشریف لائے۔ موصوف کی دوررس نگاہ نے نوجوان رومیؔ کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ ''ایں چیزے دیگرست!'' پھر شیخ بہاولد کے اس قدرداں شخص نے ان کے بیٹے رومی کو نہایت شفقت آمیز انداز میں سینے سے لگایا اور خود پدرگرامی سے یہ برملا کہہ دیا:

''ان صاحبزادے کے جوہر قابل سے غفلت نہ برتئے گا۔''

ساتھ ہی اپنی مثنوی ''اسرارنامہ'' نوجوان رومی کو پڑھنے کے لیے دی۔

حضرت عطارؒ کی گزارش اور ''اسرارنامہ'' کی پیشکش دراصل اس بات کی غماز ہے کہ خاندانِ بہاولد کے اس نوخیز رکن کا چہرہ مہرہ آنے والے دور کی صریح اور صاف جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ چہرہ جو زندگی کے نصف اول میں مسندِ علم و فضیلت پر مہرتاباں کی طرح چمکنے والا تھا اور نصف دوئم میں حُسن تصوف کا پیکر بن کر سرتاج شعرائے عالم کی جلوہ گری کا مظہر بننے والا تھا۔

Marfat.com

یہ قافلۂ بلخ نیشاپور میں ہی ٹک کر نہیں رہ گیا بلکہ وہاں سے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا.....
بغداد پہنچا، حجاز آیا، شام میں وارد ہوا.....تا آنکہ لارندہ ہوتا ہوا قونیہ میں مستقل سکونت پذیر ہو گیا۔ یہ سفر ہائے دراز، جو اہل خاندان کے جلو میں طے ہو رہے تھے، نوخیز رومؔی کی حیات کا ایک ایسا طربناک پس منظر بنتے چلے گئے جس نے انہیں مشاہداتِ عالم کا ایک بحرِ ذخّار عطا کر دیا.....جس کی لہریں نہاں خانۂ دل میں جمتی چلی گئیں۔

جب 1245ء میں یعنی عمر رومؔی کے 38 ویں سال، شمس تبریز بساطِ جلال الدین پر وارد ہوئے تو اس پس منظر کی مخفی لہروں میں ارتعاش نمایاں ہوا۔ پھر اگلے ہی سال گمشدگیٔ شمس کے ہجر آمیز بھاری پتھر نے بحرِ حیات رومی میں جو زبردست طلاطم پیدا کر دیا، وہی شہرۂ دوامِ جلال الدین بلخی المعروف بہ مولویٔ معنوی کا موجب ٹھہرا۔

ذرا ایک لمحے کے لیے توقف کر کے غور کیجیے کہ مولانائے روم کا یہ خاندانی پس منظر ان کی زندگی کی بنیاد ڈالتا رہا، اس کے خدوخال مرتب کرتا رہا، اس کے فارمیٹ کو متعین کرتا رہا، رگ و پے میں ولولے پیدا کرتا رہا، مشاہدات و تجربات کے انمول موتی بکھیرتا رہا۔ اور جب ڈھانچہ تیار ہو گیا، جب زمین پوری طرح ہموار ہو گئی، اور جب علم و فضیلت کے پھریرے نے چہار دانگ عالم میں رومی کو روشناس کرا دیا تو پھر ایک مست قلندر نے آ کر ایسا بھونچال پیدا کر دیا کہ ظاہری شان و شکوہ تو باقی نہ رہا، مگر من کی دنیا اس طرح سنور گئی کہ وہ تمام لہریں جو نہاں خانۂ دل میں مخفی تھیں، بحر مواج بن کر ابھر آئیں اور جلال الدین نے ایک نیا جنم لیا، مولویٔ معنوی کے روپ میں.....بینظیر، بے مثال، ابدالآباد تک کے لئے!

PANJAB UNIVERSITY LIBRARY

نام ونسب.....ولادت وبلوغت

نام : محمد

لقب : جلال الدین

عرفیت : مولانائے روم

مولانا رومی

مولانا روم

خداوندگار

مولانا خداوندگار

مولوی

مولانا

مولویٔ معنوی

رومی

ولدیت : محمد المعروف بہ بہاء الدین ولد/ بہاولد

نسب نامہ : محمد

Marfat.com

بن محمد

بن حسین المعروف بہ خطیبی

بن احمد

بن قاسم

بن مسیّب

بن عبداللہ

بن عبدالرحمٰن

بن ابی بکر الصدیقؓ

تاریخ ولادت : 30 ستمبر 1207ء

بمطابق 6 ربیع الاول 604ھ

مقام : بلخ (صوبہ خراسان)

جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں ذکر کر آئے ہیں، مولانائے روم کا خاندان اپنے علم وفضیلت اور حکمت ودانش کی وجہ سے پورے خطے میں ادب واحترام اور تعظیم وتکریم کا موجب گردانا جاتا تھا۔ یہ خانوادہ نسل در نسل سرفرازی وسربلندی کا پرچم لہراتا رہا تھا۔ جہاں مولانا کے دادا حضرت حسین خطیبی عوام وخواص میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، وہاں ان کے والد بہاء الدین ولد بھی علم و حکمت کی بلندترین مسند پر جلوہ فرما تھے۔ آپ کے دائرۂ تدریس میں ہزارہا شاگرد شریک ہوا کرتے تھے۔ آپ کے وعظ کی مجلسوں میں عوام الناس کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر در آتا تھا۔ نیز، مختلف اطراف وجوانب سے جویانِ حق کا قافلہ آپ کے در دولت پر حاضر ہوتا، متنوع مسائل دریافت کرتا، پیچیدہ فقہی امور کے متعلق رائے معلوم کرتا اور مذہبی معاملے میں آپ سے فتویٰ کا طلبگار رہوتا۔

اپنے والد کے اردگرد صبح ومسا بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھنا، ان کی باتیں سننا، پدرگرامی کے جوابات کی سماعت کرنا..... یہ سب وہ عوامل تھے جن سے کمسن رومی الگ تھلگ نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر وہ شیخ بہاء الدین ولد کے اکلوتے فرزند تھے۔ وہ ان کی ادھیڑ عمری میں یعنی جب شیخ بہاولد ساٹھ

Marfat.com

سال کے تھے، پیدا ہوئے تھے اور یہ ایک فطری امر ہے کہ بڑھاپے کی اولاد ہر درجہ عزیز ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ ولد اپنے بیٹے جلال الدین کو سینے سے لگائے رکھتے اور خود سے جدا نہ کرتے۔ نومولود بچے کی صحیح تربیت اور اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، اس کا ذکر متعلقہ باب میں آئے گا، لیکن یہاں رومی کے عرصۂ بلوغت میں تربیت سازی کی جانب والد بزرگوار کی بھرپور توجہ کا ذکر مقصود ہے۔ وہ دلی طور پر یہ تمنا رکھتے تھے کہ یہ اولاد نرینہ خاندانی عزت و وقار کا نمایاں نشان بنے اور باپ دادا کے ناموس، عزت، حرمت، علمی حیثیت اور دنیاوی وقار کا بھرپور انداز میں بھرم قائم رکھے۔

ان باتوں کی تکمیل کے لیے یہ ضروری امر تھا کہ نوعمر رومی کو والد اپنے ساتھ ساتھ رکھتے۔ واضح رہے کہ اگلے وقتوں میں بچے کی تربیت کا یہ ایک نہایت آزمودہ طریقہ تھا اور اس پر بیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک عمل ہوتا رہا ہے[1]۔

چنانچہ طلباء کو درس دینے کے لمحات ہوں، سائل کے سوالات کے جوابات دینے مقصود ہوں، وعظ کی مجالس منعقد ہوں، رومی ہر جگہ اپنے والد کے ''یک جان دو قالب'' کی صورت ساتھ ساتھ رہے اور اس طرح کچے ذہن کی نشو ونما ہوتی رہتی۔ معصوم لوحِ دل پر دورِ طفلی کی باتیں منقش ہوتی چلی جاتیں۔

واضح رہے کہ جملہ منعقدہ مجلسیں شریعت ہی نہیں، طریقت کی علمبردار بھی تھیں۔ ان میں فقہی مسائل کے ساتھ سلوک و معرفت کی باتیں بھی بیان ہوتیں اور طریقت و تصوف کے اسرار و رموز بھی

---

1. سرسید احمد خاں نے تعلیم و تدریس کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان سے ایک دنیا واقف ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس اور علی گڑھ کالج سے کون آشنا نہیں ہے۔ یہی سرسید اپنے خاندان کے بچوں کو کہا کرتے تھے کہ شام کو گھر کے سامنے والے میدان میں ان کے روبرو کھیلا کریں تا کہ ان کی خامیوں پر کڑی نگاہ رکھی جا سکے اور صحیح معنوں میں ان کی تعلیم و تہذیب ہو سکے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب علامہ اقبال کے استاد میر حسن سیالکوٹ سے علی گڑھ گئے تھے اور سرسید کے مہمان بنے تھے تو آخر الذکر نے اپنے لڑکے محمود کو یہ حکم دیا تھا:

''بیٹا! سید صاحب کا کھانا ان کے کمرے میں خود لے جا کر پہنچا دو، وہ عبادت میں مصروفیت کی وجہ سے بڑے ہال میں ڈنر نہیں کھا سکیں گے۔ تم اپنے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے ان کے پاس لے جاؤ اور ان کے سامنے مؤدب کھڑے رہنا، ہرگز نہ بیٹھنا اور وہ جو کچھ بولیں نہایت انہماک سے سننا۔''

Marfat.com

اجاگر کیے جاتے۔ جلال الدین رومی پیدائشی طور پر ذہین وفطین تھے۔ وہ ابدالآباد تک کے لیے ایک نابغۂ روزگار اِنسان بننے والے تھے۔ ان کا کلام بلاغت نظام پوری دنیا کو ششدر کرنے والا تھا۔ آربیری، نکلسن، براؤن، این میری شیمل اور علامہ شبلی نعمانی ان کی فکر کی تہہ بہ تہہ پرتوں کو الٹ پلٹ کر تجزیہ کرنے والے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے والد محترم کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ معلوم کیا اور بچپنے میں اس طرح ان کا پیکر تراشا گیا کہ ایک روز..... ''مناقب اللعارفین'' کے مصنف احمد افلاکی کے بقول:

''جلال الدین رومی جب چھ سال کی عمر کے تھے، ان کے بچپنے کے ساتھیوں نے ایک روز یہ منصوبہ بنایا کہ پڑوس کی چھت پر چھلانگ لگائیں۔ رومی نے اپنے ہم جولیوں سے یہ کہا کہ دوستو! یہ ایک چھت سے دوسری چھت پر چھلانگیں لگانا تو بلیوں اور کتوں کا کام ہے۔ ہم کیوں نہ ایسا کریں کہ آسمان پر چھلانگ لگائیں اور مظاہر قدرت کا نظارہ کریں۔''

مذکورہ بالا روایت کو بار بار پڑھیے اور یہ سوچیے کہ یہ کسی عمر رسیدہ شخص کی باتیں نہیں، ایک کمسن، نوخیز اور چھ سالہ لڑکے کی گفتگو ہے۔ وہ سامنے کی چھتوں پر نہیں، بلند و بالا آسمان پر چھلانگ لگانا چاہتا ہے تاکہ مظاہر قدرت کا نظارہ کر سکے۔ یہ اولوالعزمی، ارادے کی یہ اڑان، آسمان پر چھلانگ لگانے کا یہ جذبۂ بلند اور مظاہر قدرت کا نظارہ کرنے کی یہ آرزو..... اور وہ بھی چھ سال کے ایک بچے کی..... کیا اس حقیقت کا برملا اظہار نہیں کرتی کہ وقت کے جید عالم، دیار خراسان کے عظیم دینی رہنما اور خانوادۂ خطیبی کے رکن رکین شیخ بہاولد کی آغوش میں بلوغت کا زمانہ گزارنے والے یہ رومیؔ نوجواں کس طرح تربیت کے مراحل سے گزر رہے تھے۔

واضح رہے کہ آسمان پر چھلانگ لگانے والا شخص نہ تو سائنس داں ہو سکتا ہے، نہ سپورٹس مین، نہ ہی مولوی نہ ملا، نہ عالم نہ فاضل!..... یہ جذبہ تو صرف اور صرف صوفی باصفا کا ہے، درویش خدامست کا ہے اور ولی اللہ کا ہے۔ اگرچہ کمسن رومی اس وقت نہ تو صوفی باصفا بنے تھے، نہ ہی درویش خدامست قرار پائے تھے اور نہ ہی ولی اللہ کے درجے پر فائز ہوئے تھے..... لیکن یہ جذبۂ بلند، یہ عزم و حوصلہ، یہ امنگ و آرزو اس بڑے باپ کی دین تھی جس کی آغوشِ پدری میں وہ اپنا زمانۂ بلوغت گزار رہے تھے۔

Marfat.com

یہ وہ والد گرامی تھے جن کی عظمت کا ڈنکا بلاد اسلامیہ میں بج رہا تھا۔ جن کی علمیت کا شہرہ چہار دانگ عالم میں تھا۔ جن سے اکتساب فیض کرنے والے سینکڑوں نہیں..... ہزاروں میں تھے۔ ایسی بلند مرتبت ہستی کے جلو میں بیٹھ کر جو بھی بچہ بلوغت کا زمانہ گزارے گا اور خاندان کا نہایت قیمتی علمی وتہذیبی ورثہ پائے گا، وہ مستقبل میں کیا کچھ بنے گا، اس کے بارے میں تو بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے:

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ذہین وفطین، زیرک وہوشیار اور لائق وفائق بچے کے آثار ایام طفلی میں ہی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے عظیم المرتبت انسان بننے والے مولانا جلال الدین رومی کا عہد بلوغت حد درجہ تابناک ومزین تھا۔ ایک طرف ان کی جبلت اپنے اثرات دکھا رہی تھی، تو دوسری جانب علمی وادبی ماحول میں ہونے والی پرورش وپرداخت ان کے جوہر خفتہ کو مہمیز کر رہی تھی۔

اگر آپ دنیا کی عظیم شخصیات کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیں تو یہ دیکھیں گے کہ کوئی عہد طفلی میں یتیم ویسیر تھا، کوئی جہالت کی تاریکی میں نشو ونما پا رہا تھا، کوئی غربت کی چکی میں پس رہا تھا، کوئی گندی نالیوں کے غلیظ کیڑوں کی طرح رینگ رہا تھا، کوئی دستِ معصوم دراز کئے ہر راہگیر سے بھیک حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف تھا اور کوئی تنگ وتاریک گلیوں میں بدچلن وبدراہ افراد کے چنگل میں پھنس کر بدقماشی کا غلیظ ونجس لبادہ اوڑھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ سب آدم کی اولاد تھے۔ سب ہی وقتِ پیدائش ایک جیسے تھے۔ لیکن حالات کے جبر نے ان کے اسپ حیات کی باگ مختلف سمتوں میں موڑ دی تھی۔

لیکن بلخ کے یہ نوخیز سپوت ایسے تمام مکروہات دنیوی سے محفوظ ومامون تھے۔ ان کے والد جید عالم دین تھے۔ وہ فی الواقع ایک عظیم باپ تھے جن کے اردگرد مدرسین، طالبِ علمِ دین، سلاطین، امراء ومفکرین کا ایک مجمع لگا رہتا۔ پورے دیار اسلام میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ پھر، مالی طور پر بھی اس گھرانے کو کسی پریشانی کا سامنا نہ تھا۔ چنانچہ کھانے کو اچھی چیزیں اور پہننے کو عمدہ لباس مہیا کر دیئے جاتے۔ خدمت کے لیے ملازمین ہمہ وقت موجود!

ذرا مولانائے روم کے مستقبل پر نظر ڈالئے اور شمس تبریزی سے ملاقات سے پہلے کا دور

دیکھئے کہ وہ کس قدر شان وشوکت سے رہتے تھے۔ یہ دراصل زمانۂ بلوغت کا حسین پرتو تھا جو وصل مرشد تک کے لمحات پر منعکس رہا۔ اس شاندار دور بلوغت نے دراصل اس رومی کے قصرِ حیات کی تعمیر وتشکیل کی جو آنے والے دنوں میں تمام عالم کے لئے مینارۂ نور بننے والا تھا۔ اور یہ ہر کے نصیب کی بات نہ تھی ع

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

دُعائے عطّارؒ

سنہ بارہ سوبیس عیسوی حیاتِ رومی کے لیے جہاں سفر کی صعوبتوں کا ناقابل برداشت زمانہ تھا، وہاں ایک روحانی فیض سے متمتع ہونے اور ایک ذی وقار مصنف، شاعر اور درویش کی دعاؤں سے جیب و داماں کی تزئین کرنے کا درخشاں موقع بھی تھا۔

آٹھ سال پہلے جب مولانائے روم کی عمر کل پانچ سال کی تھی، وہ اپنے والد کے ساتھ اس لیے بلخ چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے کہ بادشاہِ وقت اور اسے ورغلانے والے لوگ شیخ بہاء الدین کے پاس عوام الناس کا اژدہام دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے یہ نہ سمجھا کہ آنے والے ہزاروں افراد طالب علم و ادب ہیں، طالب جاہ و حشمت نہیں! چنانچہ خوارزم شاہ نے اپنے قلعے، خزانے اور محل کی چابیاں اس پیغام کے ساتھ شیخ بہاولد کی خدمت میں بھیج دیں:

''اسبابِ سلطنت سے صرف یہ کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔''

شیخ بہاء الدین ولد نے اسے اشارۂ غیبی سمجھا اور بلخ سے ہجرت کر کے سمرقند آ گئے۔ ایک سال بعد واپس بلخ گئے اور وہاں تقریباً سات سال رہے۔ جب مغلوں کی یورش کی خبر موصول ہوئی تو دوبارہ بلخ چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور نیشاپور آ گئے۔ یہ مقام زمانۂ قدیم سے علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ ظہورِ اسلام کے بعد اس خطے سے ابھر کر ایسی ایسی بلند مرتبت ہستیاں منظرِ عام پر آئیں

Marfat.com

اور اپنے افعال و کردار کے وہ منور نقوش بساط عالم پر ثبت کر گئیں کہ زمانہ آج بھی ان کی فروزانی سے منور و تاباں نظر آتا ہے۔ جہاں عمر خیام جیسا نابغۂ روزگار اور عظیم شاعر ابھرا، وہاں حضرت ابوبکر صیدلانیؒ، شیخ ابوعلیؒ، محمد بن عبدالوہاب ثقفیؒ، شیخ ابوعثمان سعید سلام مغربیؒ جیسے ثقہ بزرگ کے اسمائے گرامی خاصے نمایاں ہیں۔

ان ہی ذی مرتبت افراد میں شیخ فریدالدین عطارؒ تھے جو شاعر بھی تھے اور معلم بھی! جو سوانح نگار بھی تھے اور وقائع نگار بھی! جو صاحب شریعت بھی تھے اور صاحب طریقت بھی! جن کے قلم نے متعدد کتابیں لکھیں جو یگانۂ روزگار بن گئیں۔ ''تذکرۃ الاولیاء'' نامی تصنیف خود ان کی بزرگانۂ عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اور گزشتہ آٹھ سو سال سے دنیائے اسلام کے ہر مکیں کے دل کو منور و تاباں کئے ہوئے ہے[1]۔

اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ عطار ایک ولی کامل تھے، درویش بے ریا تھے، علم کا بحر بے کنار تھے، فکر و دانش کا ایک کوہ گراں تھے۔ یہ وہ بلند مرتبت شخصیت تھی جسے فارسی کے عظیم شاعر شیخ محمود شبستری نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''مثنوی گلشنِ راز'' میں اس طرح خراج تحسین پیش کیا تھا ؎

مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ صد قرن یک عطار ناید

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کو شیخ فریدالدین عطارؒ سے حد درجہ عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنے متعدد اشعار میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی بین وجہ یہ تھی کہ اقبال کے مرشد روحانی مولانا جلال الدین رومی نے انہی شیخ نیشاپور سے کسبِ فیض کیا تھا ؎

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

---

1. راقم الحروف نے حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی اس ضخیم کتاب کو سلیس اردو میں تحریر کیا ہے جسے ''ذکر جمیل'' کے عنوان سے دوست پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کر دیا ہے۔ ۵۶۷ صفحات پر مبنی اس کتاب میں ۹۶ بزرگان دین کے احوال و آثار درج ہیں۔

Marfat.com

ذرہ کشت و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومی و عطّار کرد

مقام ذکر کمالات رومؔی و عطّار
مقام فکر، مقامات بوعلی سیؔنا

شیخ فریدالدین عطارؒ سے دلی عقیدت کا یہ اظہار محض مشرقی ممالک تک ہی محدود نہ تھا، یورپ کے دانشوروں نے بھی حضرت عطارؒ کی علمی فضیلت کا اعتراف نہایت وسیع القلبی کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً مارگیرٹ اسمتھ یوں رقمطراز ہیں:

''عطار نے اپنی طویل ترین زندگی ادبی کاموں کی تکمیل میں صرف کردی۔ انہوں نے نظم میں جو ضخیم ضخیم تصانیف قلمبند فرمائیں ان میں ''تذکرۃ الاولیاء'' واحد تصنیف ہے جو نثر میں لکھی گئی تھی۔ انہوں نے اپنی فکر انگیز نظموں کا دیوان بھی مرتب کیا تھا جو ہر لحاظ سے وسعت و اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے۔ اگرچہ حضرت عطار ایک شاعر کی حیثیت سے شہرت دوام سے بہرہ ور ہوئے لیکن اپنے فلسفیانہ خیالات اور صوفیانہ تصورات کے حوالے سے بھی خاصے مشہور و معروف ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ عطار کی جملہ تصانیف کا مرکز و محور ہی تصوف ہے..... اور تذکرۃ الاولیاء موصوف کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے عطار نے کافی تحقیق و تلاش کے بعد صوفیوں کی زندگی اور ان کی گراں قدر تعلیمات کے متعلق مرتب کیا تھا۔''

دیار لندن کے مشہور مستشرق اور کیمبرج یونیورسٹی کے نامی گرامی پروفیسر اے جے آربیری نے حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ سے اپنی دلی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا کہ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف ''تذکرۃ الاولیاء'' کا بہ زبان انگریزی نہایت فصیح و بلیغ ترجمہ کر ڈالا..... اور خود عطار کے مولد و مسکن نیشاپور کے مشہور فارسی شاعر کاتبی نیشاپوری نے اس عظیم شخصیت کے حضور جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے:

''میں بھی عطار ہی کی طرح گلشنِ نیشاپور سے تعلق رکھتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نیشاپور کا ایک کانٹا ہوں جبکہ حضرت عطار یہاں کے گلاب تھے۔''

اسی گلابِ نیشاپور کی خوشبوئے جاں فزا سے فیضیاب ہونے کا موقع ہمارے تیرہ سالہ ممدوح مولانائے روم کو ملا، اور کچھ اس طرح:

شیخ بہاء الدین ولد اپنے زمانے کے جید عالم اور ذی مرتبت بزرگ تھے۔ وہ بلخ سے جب روانہ ہوئے تو صرف کم عمر رومی اور گھر کے دیگر افراد ہی نہ تھے، مریدانِ خاص میں تین سو بزرگ ساتھ تھے۔ یہ قافلہ جس جس شہر سے گزرتا، وہاں کے عوام وخواص حضرت بہاولد کی زیارت کو آتے اور دست بوسی کرتے۔ جب یہ قافلہ نیشاپور پہنچا تو اس کی آمد کی اطلاع پا کر رجلِ وقت حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ حاضر خدمت ہوئے۔

کمسن رومی اپنے والد کے جلو میں بیٹھے تھے۔ بقول علامہ شبلی نعمانیؒ "سعادت کا ستارہ ان کی پیشانی سے چمکتا تھا۔" چنانچہ شیخ فریدالدین عطارؒ نے اس طفل نوخیز کو اپنے سینے سے لگایا، پیشانی چومی اور شیخ بہاءالدین ولد کو مخاطب کر کے فرمایا:

> "صاحبزادے کے جوہر قابل سے غفلت نہ برتئے گا۔ اس بچے کو عزیز رکھئے گا۔ یہ کسی دن تمام عالم میں ہلچل ڈال دے گا۔"

ازاں بعد، رومی کو اپنی گراں قدر تصنیف "اسرارنامہ" پڑھنے کو دی۔ جب تک محفل میں موجود رہے، اس جوہر قابل کو اپنے قریب ہی بٹھائے رکھا اور گاہے گاہے اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے رہے۔

شیخ فریدالدین عطارؒ جس پائے کے بزرگ تھے، اس کا اندازہ قارئین کو سطور بالا کے مطالعہ سے بخوبی ہو گیا ہو گا۔ ایسا ذی مرتبت ولی جب کسی نوعمر بچے کی بابت کچھ کلمۂ خیر کہہ دے، اس کی درخشاں پیشانی کا بوسہ لے، اس کے سر پر بار بار دستِ شفقت پھیرے اور اسے مطالعہ کے لیے اپنی کتاب تحفہ کے طور پر دے تو یقیناً اس میں اسرار و رموز پنہاں ہیں۔ اور اس کی وجہ بس اتنی ہے:

ولی را ولی می شناسد

مولانائے روم کے والد بزرگوار اپنے پسر کی تربیت سازی کے لیے جو کچھ کر رہے تھے، اس کا مفصل ذکر گزشتہ باب میں آ چکا ہے اور اب ایک ولیٔ کامل اور صوفیٔ باصفا کی گزارشِ خصوصی کو ملحوظ رکھتے

Marfat.com

ہوئے زیادہ سے زیادہ توجہ اس ''جوہر قابل'' کی طرف مبذول کرنے لگے اور خود رومی نے شیخ فریدالدین عطارؒ کے پیکر میں جس مشفق ومہربان ہستی کو دیکھا تھا، جس کی گفتگو سنی تھی، اپنی پیشانی پر جس کے مقدس ہونٹوں کے لمس محسوس کیے تھے، اپنے سر پر جس کے دستِ شفقت کی لہریں موجزن دیکھی تھیں، جس کے تحفۂ کتاب کو زندگی کی بیش بہا دولت متصور کی تھی اور جس کی دعائے اخلاص و بے ریا کو اثاثۂ جاں سمجھا تھا..... اسے ہمیشہ اپنا رہبر کامل سمجھا۔ ''اسرار نامہ'' کی شکل میں جو ہدیہ نیشاپور کے اس درویش نے رومی کو دیا تھا، اسے وہ ہمیشہ سینے سے لگائے رہے اور اس کی رہنمائی میں زندگی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اپنے آپ کو ''غلامِ شیخ عطار'' تک کہہ ڈالا ؎

من آں ملّائے رومی ام کہ از نطقم شکر ریزد
و لیکن در سخن گفتن غلامِ شیخ عطارم

حضرت عطار کا یہ عکس جمیل رومی کی ذات میں استاد کی جملہ تصانیف کے عمیق مطالعے کے بعد ہی نمایاں ہوا۔ نیز، عرفان وادب میں شیخ فریدالدین عطارؒ جس بلند مقام پر فائز تھے، وہ ایک حقیقت ثابتہ ہے..... اور ہمارے ممدوح مولانائے روم نے ان کا گہرا اثر قبول کیا۔ انہوں نے جہاں عطار نیشاپوری کے صوفیانہ افکار کی بھرپور پیروی کی ہے، وہاں مثنوی لکھنے کا سُبک اور حکایتوں میں مطلب بیان کرنے کا ہنر بھی ان ہی سے سیکھا..... بلکہ بسا اوقات شیخ فرید کی عین عبارت ہی نقل کر دی۔

غرض، جس قدآور ہستی عطارؒ نے نوخیز رومی کو یہ دعا دی تھی کہ کسی دن عالم میں ہلچل ڈال دے گا، وہی طفلِ ذہین وفطین جب 54 سال بعد شہرتِ دوام حاصل کرنے والی ''مثنوئ معنوی'' لکھنے کا آغاز کرتا ہے تو اپنے اسی نیشاپوری استاد کی مثنوی ''منطق الطیر'' کو نمونہ بناتا ہے اور اسی طرز پر آغازِ کار

Marfat.com

کرتا ہے۔

بشنو از نَے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اگرچہ مولانائے روم میں سخن سنجی کی تحریک شمس تبریز کی ملاقات کی مرہونِ منت ہے اور اس میں تیزی وشدت آخرالذکر کے گم ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہوئی، لیکن یہ بھی نا قابل تردید حقیقت ہے کہ رومی میں شعروسخن کا جذبہ شیخ فریدالدین عطارؒ کا ودیعت کردہ ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں ''اسرارنامہ'' کا مطالعہ ہی ذوق شعری کی نشوونما کا باعث بنا۔ ازاں بعد، بقول علامہ شبلی نعمانی ''خواجہ عطارؒ کی تصانیف مولانا کے لیے دلیل راہ بنیں۔''

اس طرح ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عطارؒ کی دُعا جہاں تشکیل رومی کا ذریعہ ٹھہری وہاں ان کی جملہ منظوم تصانیف، خصوصاً ''اسرارنامہ'' اور ''منطق الطیر'' سخن سنجیٔ مولویٔ روم کی بنیاد بنی۔ اس طرح شیخ فریدعطارؒ ایک وسیع النظر استاد کا درجہ رکھتے ہیں اور جلال الدین رومی ان کے ایک نیازمند شاگرد نظر آتے ہیں جب ہی تو یہ برملا کہہ گئے ہیں ؎

ہفت شہر عشق را عطارؔ گشت
ما ہنوز اندر خمِ یک کوچہ ایم

تعلیم وتربیت

مولانا جلال الدین رومی کی یہ عین خوش قسمتی تھی کہ وہ بلخ کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو علم وفضیلت اور دانش وحکمت کی وجہ سے پورے صوبۂ خراسان میں عزت وتکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ خود ان کے دادا بلند پایۂ عالم وفاضل شخص تھے اور والد شیخ بہاء الدین ولد کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ دینی علوم پر عبور حاصل کرنے کی بدولت اردگرد کے جملہ علاقوں میں ممتاز حیثیت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ درس وہ دیتے۔ وعظ وہ کہتے۔ تبلیغ وہ کرتے۔ فتویٰ وہ دیتے۔ کتابیں وہ تصنیف کرتے۔ شائقین علم وادب سے عالمانہ گفتگو وہ کرتے۔ شریعت کے آداب وہ بتاتے۔ طریقت کے اسرار ورموز وہ بیان کرتے۔ غرض ایک عالم وفاضل اور حکیم ودانا سے جن امور کی توقع کی جاسکتی ہے، وہ سب کے سب بہاء الدین ولد بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

ایسے ثقہ بزرگ اور صاحب علم شخص کی مجالس میں بیٹھنے والے افراد بھی زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو عالمانہ ومفکرانہ ہوتی تھی۔ نت نئے موضوعات پر بحث وتمحیص آئے روز کا منظر نامہ ہوتا تھا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کی کوششیں روز کا معمول ہوا کرتی تھیں۔

اور صاحب محفل شیخ بہاء الدین کا ذوق مطالعہ بھی خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ تمام مصروفیات کے اختتام پر وہ اپنے گھر میں واقع دارالمطالعہ میں گھنٹوں بیٹھ کر کتب بینی میں مصروف رہتے۔ ان کے

Marfat.com

لیے یہ کتابیں جو جملہ اسلامی ممالک سے منگوائی جاتی تھیں، ہر اہم موضوع پر لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان میں احادیث کے مستند مجموعے بھی تھے، فقہ کے موضوع پر متعدد تصانیف بھی تھیں، عربی و فارسی زبان و ادب کے متعلق لاتعداد کتب بھی تھیں۔

یہ خاندانِ بہاولد کا علمی و ادبی پس منظر تھا جس میں نوعمر رومی کے شعور نے انگڑائی لی۔ ہر طرف علم و ادب کا اُبلتا ہوا سوتا، ہر جانب پڑھے لکھے افراد کا ہجوم، ہر آن علمی و ادبی و مذہبی گفتگو کا سلسلہ، ہر لمحہ درس و تدریس کا مشغلہ!..... یہ سارے عناصر نفسیاتی طور پر نوخیز، ذہین و فطین رومی کی کشتِ حیات کی آبیاری کرتے اور ننھے منے فطری پودے کو سینچتے رہے۔ فطرت نے علم و ادب کا جو بیج ننھے ذہن میں بو دیا تھا، اس کو پنپنے کا موقع خاندان کے علمی، ادبی، ذہنی، تہذیبی، سماجی ماحول نے بدرجۂ اتم فراہم کر دیا۔

اور جب رسم مکتب نشینی انجام پائی تو رومیؒ اپنے ہی خاندانی گھر میں والد کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بٹھا دیئے گئے۔ قرآن ناظرہ پڑھا۔ عربی و فارسی ادبیات کا مکمل کورس پڑھا۔ فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ احادیث کے مجموعے کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ قرآن حکیم کا دقیق نظری سے مطالعہ کیا۔ حساب، منطق، طبیعات، مابعد الطبیعات، فلسفۂ اخلاق اور دیگر مروجہ علوم کی درسیات کو لفظاً لفظاً پڑھا۔ یہ ساری تعلیم ایک ایسے شخص کی خصوصی نگرانی میں انجام پائی جو خود متعدد علوم کا بحرِ ذخار تھا۔ جس کے پائے کا عالم و فاضل پورے صوبۂ خراسان میں اس وقت موجود نہ تھا۔ جو بلخ سے مستقلاً ہجرت کے ارادے سے نکلا تو ہر پڑاؤ پر وہاں کے اہلِ علم و بصیرت اس شخص کے تبحر علمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جوق در جوق آتے اور علم کے اس بحر بیکراں کی زیارت کرتے۔ واضح رہے کہ ان جویانِ زیارت میں شیخ فریدالدین عطارؒ جیسے بلند مرتبت مصنف و شاعر اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ جیسے ثقہ بزرگ بھی شامل تھے۔ بلکہ آخر الذکر نے بقول مولانا جامی، بغداد پہنچنے پر شیخ بہاولد کا آگے بڑھ کر استقبال کیا تھا۔

اور اس بلخی عالم کے سامانِ سفر میں دنیاوی کروفر تو نہ تھا، البتہ کئی کئی اونٹوں پر کتابوں کے لدے ہوئے بورے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ یہ مسافر کوئی ایسا ویسا بادیہ پیمانہ تھا، بلکہ علم و ادب، فکر و فن، تہذیب و تمدن کا ایک کوہ گراں تھا..... اور کمسن جلال الدین اسی کے دامن میں تعلیم و تربیت پانے والے نوخیز چٹان!

والد کی نگرانی میں رومی متداول نصاب کے مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔ والد بہاولد کو

یہ سب کچھ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوتا۔ لیکن خود ان کی اپنی زندگی خاصی مصروف کار تھی اور ذمہ داریاں تھیں کہ ان میں ہر روز اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا۔ لہٰذا اپنے پسر کو ایک ایسے اتالیق کے سپرد کر دیا جس نے پوری تندہی اور خلوص کے ساتھ اس نوخیز پودے کو پروان چڑھایا۔

جلال الدین رومی کے یہ معلم برہان الدین محقق تھے۔ شہرِ ترمذ کے رہنے والے یہ ''بیرونی'' استاد شیخ بہاء الدین ولد کے نہایت ہی مقرب مرید تھے۔ نیز، علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے۔ مروجہ علوم و فنون پر ان کی نگاہِ عمیق تھی۔ مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ بحث و تمحیص میں دائرۂ ادب سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان کی رائے جچی تلی اور صائب ہوا کرتی تھی۔ خود ان کے مرشد شیخ بہاولد کو ان کی علمیت پر کامل درجے کا اعتماد تھا۔

ظاہر ہے، اسی اعتماد کے نتیجے میں شیخ بہاء الدین ولد نے اپنے اُس ہونہار، ذہین اور لائق بیٹے اور آبروئے خاندان جلال الدین کو ان کے سپرد کر دیا تھا جس کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لیے وہ شروع سے کوشاں تھے۔ اس سپردگی کے متعلق یوں کہیئے کہ استاد کی تحویل میں دے دیا تھا۔ محقق نے بھی اس جذبۂ حوالگی کا پورا پورا پاس و لحاظ رکھا۔ ان کی ذہنی دسترس میں اور قلبی بساط پر جس قدر بھی مروجہ علوم تھے، ان سے رومی کو متمتع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اور کرتے بھی کس طرح! یہ طفل ایک ایسی ہستی کا پسر تھا، جو محقق کے پیر بھی تھے اور ہادی و رہنما بھی! اِس معلم رومی کے پاس جو کچھ بھی علمی اثاثہ تھا، وہ رومی کے باپ کا ہی عطا کردہ تھا۔ چنانچہ شیخ بہاولد کے اس ''حکم'' کو جہاں برہان الدین محقق نے اپنے لیے باعثِ اعزاز و افتخار سمجھا، وہاں ''پسرِ پیر'' کی اتالیقی و استادی کو دنیا و دین کی آبرو گردانا۔

ان ہی اسباب کی بنا پر معلمِ رومی نے اپنے شاگرد کو وہ سب کچھ دے دیا، جو عموماً اعلیٰ درجے کا استاد کم ہی عطا کرتا ہے اور یہاں معاملہ تھا:

الامر فوق الادب!

ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ مولانا رومی کی تعلیم و تربیت جس انداز میں انجام پائی، وہ کم ہی کسی نابغۂ روزگار کے مقدر کو نصیب ہوا ہے۔ یہ بھی از من الغیب ایک عطیہ تھا۔ اور ذہین و فطین رومی نے اس کو بخوبی محسوس بھی کیا اور اس سے مستفیض ہونے کی بھرپور جدوجہد بھی کی۔ بقول علامہ شبلی نعمانی

Marfat.com

''مولانا نے اکثر علوم وفنون انہی سے حاصل کیے۔''

رومی کو اپنے استاد اور اتالیق محقق ترمذی سے جو فیض حاصل ہوا اور ان کے ذہن و دل کی جس طرح جلا ہوئی، اس کے وہ ہمیشہ معترف رہے اور اسی عقیدت کے نتیجے میں وہ نہ صرف محقق کے گُن گاتے رہے ہیں بلکہ اپنے بیٹے بہاولد کو بھی ان ہی ترمذی استاد کی شاگردی میں دے ڈالا۔

مولانا رومی حصول تعلیم کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنے والد شیخ بہاءالدین ولد کے ہمراہ بلخ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکلے تو قونیہ تک کے طویل سفر کے دوران وہ نیشاپور، بغداد، شام، مکہ، زنجان اور لارندہ میں بھی ٹھہرے۔ کہیں شیخ فریدالدین عطارؒ سے ملاقات ہوئی، کہیں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی محفل میں بیٹھنا نصیب ہوا اور کہیں فخرالدین بہرام شاہ سے شناسائی حاصل ہوئی۔ اس طولانی سفر میں یقیناً اور بھی دانا و بینا حضرات رومی کو ملے ہوں گے، مگر مذکورہ تین شخصیات سے ملاقات کا تاثر ایسا نہ تھا کہ کالعدم قرار پاتا۔ شیخ عطار سے بہرہ یاب ہونے کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ شیخ شہاب بھی عطار ہی کی طرح جلیل القدر صوفی اور سلسلۂ سہروردیہ کے رکن رکین تھے۔ تیسری شخصیت بہرام شاہ کی تھی جو خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ حکمراں تھا اور اسی فطری خوبی کے نتیجے میں اہل علم وادب کی قدر افزائی کرتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کی قدر و منزلت نظام گنجوی کے دل میں بدرجۂ اتم موجود تھی اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف بہ عنوان ''مخزن الاسرار'' اس علم دوست بادشاہ کے نام معنون کی تھی۔

ہم اس مقام پر ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر یہ سوچیں کہ کیا ان تینوں قدآور شخصیات سے ملاقات، مولانائے روم کے لیے محض سرسری شناسائی ثابت ہوئی ہوگی یا کچھ اور بھی! ماہرین تعلیم کا یہ مسلسل اصرار رہا ہے کہ کسی ذہین و فطین بچے کے لیے محض کتاب، اتالیق اور استاد کا عنصر ثلاثہ ہی کام نہیں کرتا، دیگر بیرونی عوامل بھی اپنا مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں کاملین فن کی گفتگو، بحث و تمحیص کا انداز، واعظ کی گرمیٔ محفل، تہذیب وادب پر مبنی ماحول، ملاقات کا منظر نامہ، اردگرد کی فضا کا غائر تجزیہ، مختلف شہر اور وہاں کے عوام کا معیار زندگی..... غرض طریقۂ تدریس کے علاوہ بھی یہ اقدار ایک لائق و فائق بچے کی ذہنی، علمی اور ابلاغی نشوونما میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم بلاتردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومی کی تعلیم وتربیت میں طول طویل سفر کے دوران پیش آنے والے یہ جملہ عوامل اپنا اپنا حصہ ادا کرتے

Marfat.com

رہے ہیں..... یوں کہہ لیجیے کہ شیخ بہاء الدین ولد اور ان کے مرید خاص بدرالدین محقق جہاں تعلیم و تدریس کے بلاواسطہ محرک وموجب تھے، وہاں بلخ سے قونیہ تک کے طویل سفر کے مذکورہ بالا عوامل بھی بالواسطہ تعلیم وتربیتِ رومی کا مؤثر ذریعہ قرار پائے تھے..... اور تعلیمی نفسیات اور اثر وقبول کا فلسفہ ہمیں یہی سب کچھ باور کراتا ہے۔ چنانچہ نابغۂ روزگار رومی کی تعلیمی قدر و قیمت کا تجزیہ کرنے کے دوران ہمیں دس سالہ سفر اور اس کے اثرات سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔

قونیہ میں شیخ بہاء الدین ولد جب وفات پا گئے تو رومی ان کے مسند نشین ٹھہرے۔ اب چوبیس سالہ جلال الدین رومی کے کاندھے پر بہت بڑی ذمہ داری آ پڑی تھی، اس لیے کہ خالی کی ہوئی یہ جگہ ایسے شخص کی تھی جو دیارِ اسلام میں ''سلطان العلما'' کے لقب سے سرفراز ہو چکا تھا..... اور رومی نہ صرف ایسے بلند مرتبت باپ کے بیٹے تھے بلکہ سلطان العلما کے جانشین بھی! چنانچہ خود کو اس مقام و مرتبے کا پوری طرح اہل ثابت کرنے کے لیے مزید تعلیم کا حصول ان کے لیے ضروری تھا..... اور اس مقصد کی خاطر:

اِطْلُبُو العلم ولو کان فی الصَین

جیسی مستند حدیث پہ عمل پیرا ہونا لازمی تھا۔

مولانائے روم کے زمانے میں حلب اور دمشق علوم وفنون کے نہایت اہم مراکز تصور کیے جاتے تھے۔ لہٰذا مولانا جلال الدین رومی قونیہ سے حلب کے لیے عازم سفر ہوئے اور وہاں کے مشہورِ عالم مدرسۂ حلاویہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت حلب کے اس دانش گاہ کے مدرس اعلیٰ کمال الدین بن عدیم حلبی تھے۔ وہ جامع صفات کے حامل انسان تھے، یعنی محدث بھی تھے، مورخ بھی! فقیہ بھی تھے اور ادیب بھی! مفتی بھی تھے اور کاتب بھی! شاعر بھی تھے اور صوفی بھی! موصوف نے حلب کی جامع تاریخ بھی لکھی تھی۔ غرض مولانا رومی نے کمال الدین حلبی کے پیکر میں ایک ایسے استاد کو دیکھا جو ان کی تشنگیٔ علم کو بجھا سکتا تھا۔ دوسری طرف حلبی نے بھی اس نو وارد شاگرد کے روپ میں حد درجہ ذہین وفطین طالب علم کا پیکر دیکھا۔ چنانچہ اس دوطرفہ تاثر نے رومی کو سراپائے حلبی سے مستفیض ہونے کا نادر موقع عطا کیا۔ غرض، والد مرحوم اور بدرالدین محقق کے بعد اپنے اس تیسرے استاد سے جلال الدین رومی نے مضامینِ مذہبیات میں مکمل درس لیا اور جملہ فقہی مسائل پر عبور حاصل کیا۔

ازاں بعد، مولانا رومی دمشق چلے گئے اور وہاں کے مشہور مدرسۂ برانیہ میں داخل ہوئے۔ وہیں ایک حجرے میں رہتے اور تحصیل علم میں ہمہ تن مصروف و سرگرداں دیکھے جاتے۔ اس طرح کامل سات سال کا عرصہ دمشق میں گزار کر قونیہ واپس آئے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ بقول علامہ شبلی نعمانی ''مولانا نے تمام علوم درسیہ میں نہایت اعلیٰ درجے کی مہارت پیدا کر لی تھی۔'' آٹھ سالہ قیام حلب و دمشق کے دوران ان کو دنیائے علم و دانش میں جو مقام حاصل ہو گیا تھا، اس کا اندازہ ''جواہر مضیّہ'' کے مصنف کی اس روایت سے بخوبی ہو جاتا ہے:

''کَان عَالِمًا بِالْمَذَاهبُ، وَاسِع الفقه، عَالِمًا بالخلاف و انواع العلوم۔''

غرض، ظاہری علوم کے حصول کا جو سلسلہ شیخ بہاء الدین ولد، بدرالدین محقق ترمذی اور کمال الدین حلبی جیسی مخزنِ علوم ہستیوں سے شروع ہوا تھا وہ دمشق کے مدرسۂ برانیہ پر اختتام پذیر ہوا اور مولانا جلال الدین رومی خود کو اپنے والد کے لقب ''سلطان العلماء'' کے شایان شان بنانے کے پوری طرح اہل ہو گئے تھے۔

Marfat.com

درس وتدریس

جیسا کہ گزشتہ ابواب میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ مولانا جلال الدین رومی ایک ایسے خانوادے کے فرزند جلیل تھے جہاں علم کا دریا رواں تھا۔ جہاں عوام اور خواص دونوں کی اصلاح فریضۂ اول سمجھی جاتی تھی۔ جہاں طلبا کی درس وتدریس کو لازمۂ زندگی قرار دیا جاتا تھا۔ گویا پڑھنا اور پڑھانا، سمجھنا اور سمجھانا اور عمل کرنا اور کروانا یہی اس خاندانِ خطیبی کا مطمع نظر اور مقصد حیات تھا۔

مولانائے روم نے اپنی ذہانت بھری آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور ان عوامل وعناصر کو حرز جاں بھی بنالیا تھا۔ چنانچہ وہ نہایت تندہی سے حصول تعلیم میں مشغول رہے تا آنکہ چوبیس سال کی عمر میں اپنے والد شمس العلماء شیخ بہاء الدین ولد کے جانشین قرار دیئے گئے۔ اب ان کی زندگی کا مشن وہی تھا جو والد گرامی سرانجام دیتے رہے تھے، یعنی درس وتدریس!

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مولانائے روم میں قدرت نے یہ ملکۂ تدریسی تو عین طالب علمی کے زمانے میں پیدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''طالب علمی ہی کے زمانے میں عربیت، فقہ، حدیث، تفسیر اور معقول میں یہ کمال حاصل کیا کہ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا اور کسی سے حل نہ ہوتا تو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے۔''

باور کیجیے کہ جو شخص اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی اس صلاحیت کا حامل ہو کہ فضلا وحکماء

Marfat.com

کے لاینحل مسئلے کو آن واحد میں حل کر کے لوگوں کو مطمئن کر دے..... وہ یقیناً درس و تدریس کی اعلیٰ مسند پر متمکن ہونے کا اہل تھا اور رومی نے بلاشک وشبہ یہ تقاضائے معلّمی پورا کر دکھایا۔

مولانائے روم نے مذہبی تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی حاصل کی تھی۔ ان کی تربیت بھی بہت عمدہ طور پر ہوئی تھی۔ والد موصوف کی وفات کے بعد جو رہی سہی کسر تھی، وہ نہ صرف حلب اور دمشق کی درسگاہوں میں پوری ہوئی بلکہ ان کے سابق اتالیق اور استاد برہان الدین محقق نے قونیہ آ کر اسے مزید مکمل کر دی تھی اور بدیع الزماں فروزاں کے بقول موصوف جلال الدین سے یہ کہا تھا:

> ''تم نے معقولی، رسمی، روحانی اور اکتسابی علم تو بدرجۂ احسن حاصل کر لیا تھا، اب میری نگرانی میں باطنی علم سے بھی بخوبی آشنا ہو چکے ہو۔ لہٰذا اب اپنے پدر بزرگوار کے جانشیں کی حیثیت سے گمراہ انسانوں کی رہنمائی اور مذہب سے لاعلم مسلمانوں کی دینی تعلیم کی تدریس کا سلسلہ جاری کر دو۔''[1]

گزشتہ ابواب کے دورانِ مطالعہ ہم یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ مولانائے روم کے والد شیخ بہاء الدین بلخ سے ہجرت دائمی کرنے کے بعد، مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے جب بغداد تشریف لائے تو وہاں طویل عرصہ مقیم رہے۔ اس قیام میں وہ اپنے نصب العین سے سرمو غافل نہیں رہے..... یعنی درس و تدریس! آپ کی اس مجلسِ علمی میں ہر فرد بشر شریک ہو کر اپنی دینی معلومات کو وسعت دیتا اور قلب و ذہن پر پڑے ہوئے دبیز جالے کو صاف کر کے اسے مجلّٰی کرتا۔

شہر بغداد میں دیئے جانے والے درس کا سلسلہ مقامی طور پر ہی مشتہر نہیں ہوا تھا، دور دراز کے علاقوں تک اس کی خبر پھیل چکی تھی۔ چنانچہ شیخ بہاولد کے عالمانہ وعظ اور اثر انگیز پند و نصاح سے مستفیض و بہرہ ور ہونے کے لیے لوگ جوق در جوق وہاں پہنچتے اور خطیبِ دوراں کی خطابت سے شاد کام ہوتے۔

اسے حسن اتفاق کہیے کہ انہی دنوں سلطنت روم کے فرماں روا، سلجوقی سلطان علاء الدین کیقباد کے سفارت کار یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے شہرۂ خطابت اور آوازۂ تدریس بہاولد سن کر مذکورہ مجلس میں شرکت کی اور متاثر ہوئے۔ وطن واپسی پر اپنے فرمارواکیقباد کو وعظ و پند اور درس و تدریس کے

---

1 جب شیخ بہاء الدین ولد کی وفات واقع ہوئی تھی، مولانا کے استاد برہان الدین محقق قونیہ میں موجود نہ تھے۔ وہ ایک سال بعد آئے اور اپنے شاگرد کی بقیہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ انہیں 120 دنوں کی ریاضت سرانجام دینے کا حکم دیا تھا۔ اس باطنی تین چلہ کشی میں کامیاب قرار دینے کے بعد شاگرد کو مذکورہ بالا حکم دیا تھا۔

Marfat.com

اس سلسلۂ روحانی سے مطلع کیا۔ یہ سن کر شاہِ مذکور نے شیخ بہاء الدین کو اپنی سلطنت میں قدم رنجہ فرمانے اور دارالخلافۂ ملک، یعنی قونیہ میں مستقلاً قیام کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ اگلے تمام سفر کے اختتام پر قونیہ تشریف لائے۔ یہ سنہ 1229ء کی بات ہے اور تاریخ تھی 3 مئی کی۔ مولانائے روم اکیس بائیس سال کے جوان رعنا کی حیثیت میں والد کے پابہ رکاب تھے۔

سلطنت سلجوقی کے عظیم الشان دارالخلافہ قونیہ میں اس خانوادۂ بلخ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ سلطان کیقباد نے اپنے معزز و محترم مہمان شیخ بہاء الدین ولد کے لیے جہاں دنیاوی ساز و سامان فراہم کیے وہاں اعلیٰ درجے کا ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا تا کہ آپ طلبا کو فقہ اور دیگر علوم دینیہ کی تعلیم دے سکیں۔

مولانائے روم بھی اس مدرسے میں والد گرامی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے رہے اور دینی علوم کے بحرِ ذخار سے اپنی تشنگی بجھاتے رہے۔ واضح رہے کہ ان کے اتالیق بدرالدین محقق وہاں موجود نہ تھے اور شیخ بہاؤلد اکیس سالہ جلال کو بے دست و پا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ گویا مدرسۂ قونیہ میں والد بزرگوار کے زیرِ سرپرستی ان کا یہ تعلیمی سلسلہ دو سال جاری رہا۔

اور جب 1231ء میں بلخ کے نامور عالم حضرت بہاولد انتقال فرما گئے تو ان کے صاحبزادے جلال الدین رومی مولانائے محترم بن کر ان کی مسند پر متمکن ہوئے اور درس و تدریس کے پیشے میں منہمک ہو گئے۔ چونکہ وہ پیدائشی طور پر ذہین و فطین واقع ہوئے تھے اور فن خطابت کا خاندانی ورثہ پایا تھا، لہٰذا بہ حیثیت مدرس نام کماتے گئے۔ تاہم ''شمس العلماء'' کی مسند پر بیٹھنے کے بعد اس کا بدرجۂ کمال اہل ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی خیال کے پیش نظر عازمِ حلب و دمشق ہوئے اور وہاں سے کندن بن کر لوٹے۔ پھر، وہ تھے، مدرسہ تھا، طلبا تھے اور سلسلۂ ہائے تدریس!

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا جلال الدین رومی خاص پیشہ ہائے درس و تدریس کے لیے ہی پیدا کیے گئے تھے۔ ان کا اندازِ خطابت، ان کا طرزِ استدلال، ان کی نکتہ آفرینی، ان کا طریقہ ہائے تدریس، ان کا اثر انگیز مکالمہ، طلبا کا جائزہ لینے والی ان کی نگاہ عمیق!..... یہ وہ صفتیں تھیں جنہوں نے مولانا رومی کو اپنے وقت کا ایک اعلیٰ مدرس، ایک تجربہ کار معلم اور ایک نبض شناس رہنما بنا دیا تھا۔ وہ ہر طبقے میں مقبول تھے۔ سلجوقی سلطان کا دربار ہو، عوام کی محفل ہو، خواص کی بزم ہو، طلبا کی اقامت گاہ ہو..... ایک معلم بے بدل اور مدرّسِ بے مثال کے طور پر ان کا تذکرہ جاری رہتا۔ گویا سلطنتِ کیقباد

میں مولانا جلال الدین رومی کا ڈنکا بج رہا تھا۔

اور جہاں تک ان کی علمیت، فصاحت اور بلاغت کا تعلق تھا، کوئی شخص بھی قونیہ تو قونیہ..... کسی بھی جگہ ان کا مدمقابل نہ تھا۔ وہ اپنی علمی دسترس، فطری اپج، صاف گوئی، دینی استقامت اور مذہبیات میں کامل عبور رکھنے کی وجہ سے ایک ایسا مقام حاصل کر چکے تھے جو حقیقتاً دنیائے اسلام کے لیے باعث اعزاز تھا۔ ان کی ہر رائے صائب سمجھی جاتی تھی، ان کا ہر قول قولِ فیصل تصور کیا جاتا تھا، ان کا پڑھایا ہوا سبق، سبقِ آخر تھا، ان کی ہر گفتگو اٹل اور ان کا ہر بیان پتھر کی لکیر کے مترادف تھا۔ وہ قونیہ کے قاضی تھے اور لامثال!..... وہ سلطنت کیقباد کے مفتی تھے اور بے نظیر! وہ مدرسے کے مدرس تھے اور لاجواب!

یہاں یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ جب شیخ بہاء الدین ولد بلخ سے ہجرت کر کے نیشاپور آئے اور ان کا سفر قونیہ پر اختتام پذیر ہوا تو ان کے ہمراہ صرف اہل خاندان ہی نہ تھے، ہزاروں شاگرد اور عقیدت مند بھی تھے۔ یہ سب ان کے جاں نثار تھے۔ عقیدت مند اور حلقہ بگوش تھے۔ یہ تمام افراد بہاولد کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ارجمند مولانا جلال الدین رومی کے پروانے بن گئے۔ ان تمام افراد نے آپ کی ذات میں مخلص مدرس، ہمدرد استاد اور بے ریا رہنما کی جھلک دیکھی۔ پھر، اس علاقے کے رہنے والے اور اردگرد کی بستیوں کے مکین جوق در جوق مولانا کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ ان لوگوں میں جہاں عام سطح کے لوگ تھے وہاں دانشوران عصر بھی تھے، علمائے زمانہ بھی تھے اور فضلائے دوراں بھی تھے۔

جملہ افراد مولانائے روم کے حلقہ بگوش بن کر ان کی تدریس سے متمتع ہوتے، ان کی گوہر افشانی سے جیب و داماں کی تزئین کرتے اور ان کی حکمت آمیز گفتگو سے ذہن و دل کو اجال دیتے۔ ہزاروں ہزار شاگردوں کا مجمع ہمہ وقت مولانائے روم کے ساتھ رہتا۔ اس لئے کہ وہ چلتی پھرتی قاموس تھے۔ راہ میں اقوال کے موتی بکھیرتے جاتے اور طلبا و عقیدت کیش حضرات انہیں اپنے دامن میں سمیٹتے چلے جاتے۔

ایسا مقبول و معتبر استاد تاریخ کے کسی دور میں اجاگر نہیں ہوا تھا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے ع

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

لیکن یہاں ایک ایسا بطل جلیل تھا جو صوبۂ خراسان کے تاریخی شہر بلخ سے اکیلا ہی چلا تھا.....

اور قونیہ پہنچنے کے بعد یہ صورت سامنے آئی۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

طالب علموں، دانشوروں، تشنگانِ حق وصداقت اور طالبانِ حکمت وفن کا ایک عظیم الشان کارواں تشکیل دینے والے مولانا جلال الدین رومی کا یہ منظر شاہانہ بھی عالم روزگار نے دیکھا کہ آپ نہایت کروفر کے ساتھ فرشِ مزین پر متمکن ہیں۔ طلبا مؤدب بیٹھے ہیں۔ جویان حکمت ودانش سراپا ادب بنے تشریف فرما ہیں۔ پاس ہی حوض میں نصب شدہ فوارہ سے پانی کا ترشح گلرنگ سماں پیدا کر رہا ہے۔ مولانائے روم نہایت ہی پُر وقار انداز میں علم وحکمت کے موتی لٹا رہے ہیں..... کہ معاً بوسیدہ سی کالی کملی لپیٹے ایک مجذوب وہاں در آتا ہے۔ اور پھر.....

پوری طرح ملی بھی نظر سے نظر نہیں
عالم یہ ہو گیا کہ کچھ اپنی خبر نہیں

مولانائے روم دنیائے علم وحکمت سے بالکل بے خبر ہو گئے۔ سلسلۂ تدریس منقطع ہو گیا۔ اصلاح وتربیت کے تار و پود بکھر کر رہ گئے..... اور یہ آنے والا کون تھا؟..... اگلا صفحہ اُلٹ کر معلوم کر لیجیے۔

Marfat.com

قُربِ تبریزی

وہ 1244ء کا زمانہ تھا۔ شہر تبریز میں ایک ایسے بلند پایہ بزرگ تھے جنہیں مورخین نے ملائیت، کینہ توزی اور تعصب کی آنکھوں سے دیکھا۔ جنہیں یہ رجلِ غیب ہمیشہ ایک معمہ نظر آئے.....اس لیے کہ ایسے تمام مورخین، ناقدین، مفسرینِ کلام رومی اور سوانح نگارانِ مولانا نے مذکورہ شخصیت کو علوم ظاہری کے پیمانے سے ناپا، بندھے ٹکے اصول سے جانچا اور اپنے ہی تراشیدہ قانون کے دائرے میں کھڑا کر کے اس کی تکابوٹی کرنے کی کوشش کی.....محض اس لیے کہ آں بزرگ نے مولانا جلال الدین رومی کو مسندِ مفتیٔ اعظم سے اُٹھا دیا تھا۔ جنہوں نے مدرسۂ قونیہ کے احاطے سے اس ثقہ عالم وقت کو نکال کر طبلہ بجانے، موسیقی سننے اور ناچنے گانے پر آمادہ کر دیا تھا۔ لیکن اسرار و رموز الٰہی سے یہ تمام مورخین، ناقدین، شارحین اور سوانحی کاتبین سر مو واقف نہ تھے۔ انہیں وسعتِ ذوق نظر نصیب نہ تھی اور ''حسنِ دوست'' کی پہنائیوں سے وہ سراسر ناواقف تھے۔ بقول شاعر ؎

عالم تمام آئینۂ حسنِ دوست ہے
لیکن نصیب وسعت ذوقِ نظر نہیں

سارے زمانے کے معتوب یہ وہ شخص تھے جنہوں نے تقریباً آٹھ سو سال قبل آنحضرت ﷺ کی

Marfat.com

شان میں اس طرح مدح سرائی کی تھی:

''اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ اللہ رب العزت کے محبوب ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو حد درجہ عزت واحترام عطا فرمایا ہے۔ آپؐ ہی اس کائنات کے محور ہیں۔ آپؐ تمام پیغمبروں اور اولیاء اللہ کے محبوب نظر ہیں۔ یہ شمس تبریزی کس طرح آپؐ کی تعریف بیان کرنے کے لائق ہو سکے گا۔ آپؐ بلاریب مصطفےٰ ہیں، مجتبیٰ ہیں اور سارے ہی عظیم انسانوں سے عظیم تر ہیں۔'' (ترجمہ)

یہی وہ بزرگ تھے جنہوں نے رقیق القلبی، آہ نیم شبی اور آنسوؤں کی لڑی کے جلو میں خداوند قدوس کے حضور یہ دعا مانگی تھی:

''اے پروردگار عالم! میں عرصۂ دراز سے تیری عبادت کر رہا ہوں۔ تو نے مجھے عرفان وحکمت کی دولت عطا فرمائی ہے۔ تو نے مجھے مسند ولایت پر بٹھایا ہے۔ اب کمی ہے تو اس بات کی کہ میں کسی ایسے انسان سے ملاقات کروں جو رضائے الٰہی میں سب سے زیادہ مقرب ہو تا کہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر تیرے عطا کردہ علم وعرفان کی دولت میں سے اسے بھی کچھ دوں، اسے بھی عشق حقیقی کے اسرار ورموز سے آگاہ کروں اور اپنی ولایت کی مسند پر اسے بٹھاؤں۔''

شہر تبریز کی ساٹھ سالہ بزرگ شخصیت کی مذکورہ دعا مستجاب ہوئی اور غیب سے ندا آئی:

''اے بندے! تیری دعاء ہم نے قبول فرمالی۔ تیری خواہش کے مبوجب ایسا شخص تبریز میں نہیں ملے گا۔ اس کے لئے تجھے اپنا وطن چھوڑنا ہوگا، طویل مسافت طے کرنی ہوگی۔ اگر تو مسافرت کی تکالیف برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہے تو رُوم کے شہر قونیہ کے لیے روانہ ہو جا۔ وہاں تجھے جلال الدین رومی ملے گا۔ وہ شخص اپنے وقت کا مفتی، عالم وفاضل اور برگزیدہ بندہ ہے۔ اسی کی قربت میں تیری آرزو پوری ہوگی۔ وہی تیری ولایت کا جانشیں اور علم وعرفان کا مستحق ہوگا۔''

جس ہستی کی بابت غیبی اشارہ کیا گیا، وہ محض 36 سال کا جوان رعنا تھا..... اور مستجاب دعا سے سرفراز ہونے والے شخص زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ تقریباً نصف عمر کا یہ تفاوت اس مقولے کی صحیح تصویر ہے:

بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال

Marfat.com

جس باشندۂ تبریز کو قبولیت مناجات کے زیر اثر روم جانے اور مولانا جلال الدین رومی سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی، ان کا نام نامی ہے شمس الدین تبریزی! اگرچہ ابتدائے عمر میں وہ کسی اور ہی فرقے سے وابستہ تھے لیکن ازاں بعد اس مسلک کو ترک کر کے ایک خدا رسیدہ بزرگ بابا کمال جندی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان کی نگرانی میں طریقت و معرفت اور سلوک و عرفان کی تمام منزلیں طے کر لیں۔

شمس تبریز ابتدائے عمر سے ہی فقر و درویشی کی زندگی کے خوگر تھے۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ چالیس روز تک فاقہ کرتے اور اس دوران مسلسل عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ آپ ہمیشہ گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے اور عوام الناس سے کترایا کرتے۔ گویا اخفا آپ کا وطیرہ تھا۔ اور اسی پردۂ خفا میں رہ کر سخت ترین عبادت و ریاضت کرنا پسند کرتے تھے۔

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ عوام الناس ایسے عبادات گزار اور خلوت نشیں بزرگوں کی تاک میں رہتے ہیں اور ان کے پاس کسی نہ کسی غرض سے پہنچ ہی جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ عموماً دعا و تعویذ کے خوگر ہوتے ہیں اور جھاڑ پھونک کو مقصد حیات سمجھتے ہیں۔ مگر شمس تبریز کا مسلک ہی جدا تھا۔ وہ فنا فی العشقِ الٰہی تھے اور اس سے سر مو تجاوز کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ سلوک و معرفت کے راہی اپنے جملہ اوقات یاد الٰہی میں بسر کرنے کے متمنی ہوتے ہیں نہ کہ مجمع لگانے اور کاروبار چمکانے کے!

جب اہل تبریز نے آپ کو اس طرح غرقِ عبادت دیکھا اور ولئ کامل کے مقام پر متمکن پایا تو لگے ان کے گرد پھیرا لگانے۔ دنیاوی آرزوؤں کے حصول کی خاطر ان کے اوقات عبادت میں مسلسل مخل ہوتے۔ شمس تبریز کے منع کرنے کے باوجود آنے والوں کا اژدہام کم نہ ہوا۔ چنانچہ آپ نے مجبور ہو کر ایسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا جو سراسر کاروباری تھے اور دنیا کے طمع میں شب و روز مصروف رہتے۔ یہ بہروپ حد درجہ کارگر ثابت ہوا۔ لوگوں نے انہیں بھی لین دین میں ملوث پایا تو ان کی طرف سے متنفر ہوتے گئے اور یوں مجمع چھٹ گیا۔ وہ تنہا رہ گئے.....اور شمس تبریزی یہی چاہتے تھے۔ گوشۂ کلبہ، لمحاتِ تنہائی اور ہمہ تن مصروفِ عبادت!

شمس تبریز کوئی منگتا قسم کے فقیر نہ تھے۔ وہ نام و نمود اور شہرت و عظمت کے شیدا بھی نہ تھے۔ وہ

Marfat.com

تو عشق الٰہی میں سرشار ایسے بوریا نشیں تھے جنہوں نے دنیاوی عیش و عشرت کو تیاگ دیا تھا اور ہر سرفرازی و سربلندی کو ٹھوکر مار کر سلوک و معرفت کی وادیٔ پُر خار میں گم ہو گئے تھے۔

اُدھر، شمس تبریزی کے مطلوب مولانا جلال الدین رومی قونیہ میں اس طرح بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے کہ ایک جانب مفتیٔ اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے تو دوسری جانب مدرسۂ کیقباد کی مسندِ مدرس اعلیٰ پر متمکن تھے۔ قیمتی لباس زیب تن تھا۔ فرشِ قالین پر نشست تھی۔ اعلیٰ درجے کا رکھ رکھاؤ تھا..... اور اردگرد..... ہزاروں طالب علموں، نیاز مندوں، عقیدت کیشوں کا مجمع لگا رہتا۔ سلسلۂ وعظ جاری رہتا۔ فتوے صادر کیے جا رہے ہوتے۔ علم و حکمت کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہوتیں۔ دانشمندی کے موتی رُل رہے ہوتے..... یہ کیفیت، یہ صورتِ حال، یہ انداز اس فقیرِ بے ریا سے یکسر مختلف تھا جو بوسیدہ کملی میں لپٹا رہتا، جس کی زلفیں الجھی ہوئی تھیں، جس کی دراز داڑھی کے بال بے نیاز شانہ تھے۔ مگر..... جس کا سینہ انوارِ الٰہی سے روشن تھا۔

اور یہی آخری صفت اولیٰ وقت کے عظیم عالم، مفتی اور مدرس کی شخصیت میں مفقود تھی۔ اسی خلا کو پُر کرنے کا بندوبست کسی مخلوق نے نہیں، خالقِ مخلوق نے کیا تھا اور وہ اس طرح کہ ایک رات مولانائے روم نے خواب میں دیکھا کہ کوئی غیبی ندا ان سے ہمکلام ہے:

> ''جلال الدین! تم نے ظاہری علوم میں یقیناً اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ میں مثالی درجہ رکھتے ہو۔ تمہارا تقویٰ بھی قابلِ تعریف ہے..... لیکن تم میں علوم باطنی ناپید ہے۔ جذب و سکر، صحو و سلوک اور قلب مجلّٰی سے تم محروم ہو۔ معرفت و طریقت کی راہ سے ناآشنا ہو۔ لہٰذا تمہاری روحانی و باطنی تعلیم کے لیے ہم نے تمہارے پاس ایسے شخص کو بھیج دیا ہے جو بحرِ سلوک و معرفت کا ایک مشّاق شناور ہے۔ اس کا نام شمس الدین تبریزی ہے۔ اب اسے تلاش کرنا اور اس کی تعلیمات سے متمتع ہونا تمہارا کام ہے۔''

یہ صدا مولانائے روم کے دل کی اتھاہ گہرائی تک اتر گئی۔ انہیں اس غیبی اطلاع سے یک گونہ سکون حاصل ہوا۔ ایک دین دار اور صوفی گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ راہ سلوک میں گامزن ہونے کی تمنا ضرور رکھتے تھے..... مگر اس سلسلے میں ان کی تعلیم ہی کہاں ہوئی تھی۔ والد شیخ بہاء الدین ولد کی صحبت میں اس رمز سے تھوڑی بہت شناسائی ضرور ہوئی تھی۔ پھر، شیخ فرید الدین عطارؒ سے مختصر سی

Marfat.com

ملاقات اوران کی کتاب ''اسرارنامہ'' نے اس جذبے کو ہلکا سا مہمیز کیا تھا۔ البتہ استاد بدرالدین محقق نے 120 دن کے چلّے کے دوران کچھ عارفانہ تربیت دی تھی، مگر راہ سلوک کا طویل سفر شروع ہی کہاں ہوا تھا۔ تین چلّے بھلا کوئی حیثیت رکھتے ہیں؟

چنانچہ مذکورہ خواب میں دیئے گئے پیغام سے مولانائے روم کو از حد خوشی محسوس ہوئی۔ یہ ایک عطیۂ خداوندی تھا جو انہیں شمس تبریزی نامی شخص کی صورت میں ملنے والا تھا۔ مگر یہ خیالات بھی رہ رہ کے دل میں جاگزیں ہو رہے تھے:

''آخر یہ تبریزی نام کا شخص ہے کون؟ اور میں اسے کہاں تلاش کروں؟ میرے پاس اس کام کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔ یہ درس و تدریس کا سلسلہ! یہ وعظ و پند کے فرائض! مفتیٔ اعظم کی یہ ذمہ داری! ہزاروں طلباء کی یہ رہنمائی! لاکھوں فرزندان اسلام کی یہ رہبری! اُسے آنا ہے تو خود ہی آ جائے گا۔ میں کہاں کہاں سرگرداں پھروں۔''

پھر، مولانا جلال الدین رومی مذکورہ فرائضِ منصبی میں ایسے مگن ہوئے کہ انہیں خواب بھی یاد نہ رہا۔ راہِ طریقت میں رہنمائی کے لیے آنے والے شمس تبریزی بھی ذہن و دل سے محو ہو گئے۔ اب وہ تھے، طلباء کا ہجوم تھا، فرائض منصبی تھے اور شان و شوکت سے پُر زندگی کا اندازِ طمطراق!

اُدھر شہر تبریز میں غیبی ندا سُننے کے بعد شمس الدین اپنے وطنِ مالوف سے روانہ ہوئے اور قریہ قریہ کی خاک چھانتے ہوئے سوئے منزل رواں دواں تھے، ایک ''پرندے'' کی طرح!..... وہ آگے بڑھتے رہے، حتیٰ کہ قونیہ پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے خود کو ایک تاجر کے نام سے روشناس کرایا اور ایک سرائے میں مقیم ہوئے۔ مگر اندرونِ خانہ ایک خستہ چٹائی تھی، اینٹ کا ایک تکیہ تھا اور شکستہ سا ایک پیالہ تھا۔

بوریا تھا، کچھ شبینہ مے تھی یا ٹوٹے سبو
اور کیا اس کے سوا مستوں کے میخانے میں تھا

(شاد عظیم آبادی)

وہاں دعائے مستجاب کے ماحصل مولانا رومی سے جس طرح ملاقات ہوئی، اس کا حال

Marfat.com

''تقدیم'' میں پڑھ لیجیے[1]۔

البتہ اس دوران ملاقات دو مرتبہ ادا کیے جانے والا یہ جملہ پھر زیرلب دُہرا لیجیے:

''چیز یست کہ تُو نمی دانی!''

پہلی بار یہ جملہ مولانا نے کہا تھا جب ایک مجذوب نے ان کی کتاب اٹھائی تھی۔ پھر وہ اندرون حویلی چلے گئے تو شمس نے ساری کتابیں حوض میں ڈال دیں۔

جب تبریز کے اس نووارد درویش نے اپنا ہاتھ حوض میں ڈالا اور ساری کتابیں، سارے مسودے، سارے مخطوطے پانی سے نکال کر باہر رکھ دیئے جو بالکل صحیح سالم تھے تو وقت کے جید عالم و فاضل اور ظاہری علوم کے پیکر مولانا نے عالمِ حیرت میں اس انوکھے اور عجوبے کام کا سبب دریافت کیا تو شمس تبریزی نے جلال الدین رومی کا وہی جواب لوٹا دیا جب انہوں نے ایک خستہ حال، پھٹے پرانے کپڑے میں ملبوس درویش کو کتاب کی ورق گردانی کرتے وقت کہا تھا:

''چیز یست کہ تُو نمی دانی!''

مولانا جلال الدین رومی کو معاً اپنا ''خواب'' یاد آ گیا۔ دریافت کیا:

''آپ کہیں شمس تبریزی تو نہیں ہیں؟''

''ہاں! میں ہی ہوں۔ خدا نے مجھے تمہاری تربیت کے لیے بھیجا ہے۔'' انگارے جیسی سرخ آنکھوں سے رومی کو گھورتے ہوئے جلالی درویش نے کہا۔ اور پھر.....

پوری طرح ملی بھی نظر سے نظر نہیں
عالم یہ ہو گیا کہ کچھ اپنی خبر نہیں

دُنیائے اسلام کے نامور عالم دین، ممتاز فقیہہ اور سلطنت کیقباد کے مفتی اعظم مولانا جلال الدین

---

1 شمس تبریز سے مولانائے روم کی ملاقات کے متعدد واقعات درج کیے گئے ہیں۔ کہیں چبوترے کے سامنے سے مولانا کے شاگردوں کے جلوس میں گزرنے اور تبریزی کی ملاقات کا ذکر ہے تو کہیں ابن بطوطہ کے سفرنامے کا حوالہ دیا جاتا ہے جہاں یہ واضح ذکر ہے کہ ایک حلوائی حلوہ بیچتا ہوا آپ کے مدرسے میں پہنچا اور آپ نے اس شخص سے حلوہ مانگ کر کھایا۔ پھر آناً فاناً آپ کی کایا پلٹ گئی۔ مگر یہ سب باتیں اختراعی ہیں۔

Marfat.com

رومی شمس تبریزی کے قدموں میں گر پڑے۔ آپ نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگایا۔ پھر با قاعدہ بیعت کر کے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرلیا۔

یہ ڈرامائی ملاقات جو 28 نومبر 1244ء کو وقوع پذیر ہوئی تھی، نہایت وسیع و عریض اثرات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ گویا مولانا رومی کے بحرِ حیات میں یہ ایک ایسا وزنی پتھر بن کر گری کہ اس کے تلاطم سے اٹھنے والی لہریں سب کچھ بہا کر لے گئیں اور بلخ کے خاندانِ خطیبی کا اکلوتا چشم و چراغ بزم صوفیا کا آبرو بن گیا۔

پھر کے نگاہ چار سو ٹھیری اسی کے روبرو
اُس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا
(نظیر اکبرآبادی)

انقلابِ حیات

تاریخِ عالم میں ایسی ساعت اور اس نوع کا لمحہ کبھی نہیں گزرا جو مدرسۂ کیقباد کے مدرّسِ اعلیٰ کے وسیع وعریض مکان کے صحن میں اچانک وقوع پذیر ہوا۔ وہ ایک شخص تھا، بوریہ نشیں، کملی زیب تن کئے ہوئے، سرخ سرخ آنکھوں سے شعلے اگلنے والا۔ اینٹ کا تکیہ اور ٹوٹا پیالہ استعمال کرنے والا۔ چالیس چالیس دنوں تک فاقہ کرنے کی حالت میں خدائے قدوس کی عبادت میں منہمک رہنے والا۔ عالم ہاوہو سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والا۔ اپنی ذات میں مگن! اپنے خیالات میں غرق! یہ تھے صوفیٔ باصفا شمس تبریزی!

ٹھیک اس مجذوب کے سامنے قیمتی عبا، چغہ اور دستار میں ملبوس ایک ایسا شخص دبیز قالین پر فروکش تھا، علم وفضیلت میں کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا۔ جس کا مطالعہ وسیع تھا، جس کی تعلیم محکم تھی، جس کا ہر استدلال وزنی، جس کی ہر رائے وقیع اور جس کا ہر فتویٰ اٹل ہوتا تھا۔ وہ ایک مجلسی آدمی تھا، بھیڑ بھاڑ پسند کرنے والا! جب وہ خچر پر سوار ہوکر گھر سے باہر نکلتا تو ہزاروں طلبا کا جاں نثار قافلہ اس کے جلو میں ہوتا۔ جب وہ وعظ کی بزم سجاتا تو سامعین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہر چہارِ جانب ابل آتا۔ اس کے اردگرد عقیدت مندوں کی ایک فوج ظفر موج جمع رہتی۔ اس میں ادنیٰ بھی تھے اور اعلیٰ بھی! امیر بھی تھے اور فقیر بھی! بادشاہ بھی تھے اور رعایا بھی! افسران حکومت بھی تھے اور کاروباری افراد بھی! علمائے دین بھی

Marfat.com

شامل ہوتے اور عمائدین شہر بھی! اس طمطراق پسند شخص کو لوگ مولانا جلال الدین رومی کے نام سے یاد کرتے تھے۔

لیکن ایک بوریا نشیں اور گدڑی پوش فقیر نے معانقہ کیا کیا، اس طمطراق پسند شخص کی دنیا ہی متبدل ہوگئی۔ اس نے درس وتدریس کا پرچم ہاتھ سے پھینک دیا۔ وعظ وتلقین کا سلسلہ ترک کر دیا۔ مفتی کی مسندِ جلیلہ کو لات ماردی۔ طلبا سے منہ پھیر لیا۔ عوام سے کنی کاٹ لی۔ جاہ وحشمت کو تیاگ دیا۔ مذکورہ بلند وبرتر شخصیت آناً فاناً ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اب وہ تھا اور اس کا مرشد، محبوب اور پیا..... شمس تبریز!

دونوں عاشق ومعشوق خلوت گزیں ہوکر اسرار الٰہی کی بابت گفتگو کرنے لگے۔ توحید و رسالت، حقیقت ومعرفت، سرچشمۂ حسن مطلق، عشق کی صداقت، اتصالِ محبوب حقیقی کے رموز، وصالِ یار کے نکات، من وتو کا حدّ تفاصل..... غرضیکہ جملہ موضوعاتِ طریقت زیر بحث آتے، کھل کر ان پر گفتگو ہوتی اور ہر نکتہ واشگاف کیا جاتا۔ مولانا رومی سلوک ومعرفت کے میدان کے ایک طفل مکتب بن کر پیر تبریزی کی عارفانہ گفتگو سنتے اور اسرار ورموزِ عرفان وصداقت سے آشنا ہوتے۔ انہیں شمس کی صحبت میں وہ لذت ملتی کہ پہروں ان ہی کے ساتھ خلوت نشیں رہتے۔ چلّہ کشی بھی کرتے، صوم وصلوٰۃ کی پابندی بھی کرتے۔

ملاقاتِ شمس کے بعد مولانائے روم کی کایا پلٹ چکی تھی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ رقص ونغمہ، سرود و ساز اور محفل سماع سے سخت احتراز تھا اور اب ہر لمحہ رقص کناں رہتے، ساز وسرود سے جی بہلاتے اور چنگ ورباب کی لَے پر سر دھنتے۔ ایسی صورت حال میں نہ انہیں اب اپنے فرائض منصبی یاد رہتے نہ تدریس کی فکر لاحق ہوتی نہ وعظ وپند کی جانب طبیعت مائل ہوتی۔ بس وہ تھے اور صحبتِ شمس تبریزی!

مولانائے روم کی اس تبدیلیٔ ہیئت پر طلباء ہی نہیں، پورے عمائدین شہر برافروختہ تھے۔ ان سبھوں کو حیرت تھی کہ تبریز سے آنے والے گدڑی پوش اور بوریا نشیں درویش نے ان کے ہر دلعزیز اور معزز رہنما پر کیسا جادو کر دیا ہے کہ وہ بس اسی کے ہوکر رہ گئے ہیں۔ نہ کہیں آتے ہیں نہ جاتے ہیں۔ اب ان میں نہ وہ طمطراق ہے نہ ہی شان وشکوہ کے آثار!..... وہ تو بس دیوانے سے نظر آنے لگے ہیں۔

اُدھر شمس تبریزی حسب ارادہ اپنے مرید کو اسرار ورموز طریقت کی تعلیم دیتے رہے۔ روحانیت کی پیچ در پیچ منازل طے کراتے رہے۔ عشق حقیقی کے آداب سکھاتے رہے۔ قرب الٰہی کی راہ سے آشنا

Marfat.com

کرتے رہے۔ جب مولانا رومی میں ''پیر رومی'' کے آثار پوری طرح جلوہ گر دیکھے تو ایک دن مرید کے آدابِ اطاعت کو آزمانا چاہا۔ چنانچہ بول اٹھے:

''جلال الدین! مجھے اس وقت ایک خوبصورت عورت کی خواہش ہے۔ میں تم سے اس وقت خوش ہوں گا جب تم میرے لئے ایک خوبصورت اور جوانِ رعنا عورت لا دو گے۔''

مولانائے روم نے بغیر کسی پس و پیش کے اپنی اہلیہ کو جو حسن و جمال کا پیکر تھی، اپنے مرشد تبریزی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب انہوں نے اپنے سامنے مولانا رومی کی بیوی کو دیکھا تو فرمانے لگے:

''میں نے تمہیں اس عورت کے لیے تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو میری بیٹی ہے۔''

پیر کی یہ بات سن کر مولانا نے کہا:

''مرشدی! میری نگاہ میں اس سے بہتر اور حسن و جمال میں یکتا اور کوئی عورت نہ تھی، لہٰذا اسے پیش کر دیا۔ ویسے میری یہی خواہش ہے کہ اپنی خوب سے خوب تر چیز آپ کے قدموں میں نثار کر دوں۔''

یہ گفتگو سن کر شمس تبریزی نے مولانائے روم سے یہ کہا:

''مجھے اب عورت کی خواہش نہیں ہے۔ اگر تم لا سکو تو ایک خوبصورت سا نوخیز لونڈا لا دو۔''

یہ حکم سنتے ہی مولانا جلال الدین رومی نہایت سُرعت کے ساتھ اندرون خانہ گئے اور اپنے چھوٹے بیٹے کو لا کر مرشد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مرشد اس مرتبہ پھر خفا ہوئے اور مرید سے کہنے لگے:

''میں نے تمہیں یہ لڑکا لانے کو تو نہیں کہا تھا۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔''

مولانا نے پیر کی یہ بات سنی تو پہلے کی طرح گویا ہوئے:

''یا مرشدی! میں آپ کا غلام اور حکم کا بندہ ہوں۔ اپنی ہر اچھی اور پسندیدہ چیز آپ پر قربان کر دینے کی تمنا رکھتا ہوں۔''

اپنے مرید کی یہ باتیں سن کر پیر شمس تبریزی نے لڑکے کو بھی واپس کر دیا۔ پھر یوں گویا ہوئے:

''اب جاؤ اور میرے لئے شراب کا بندوبست کرو۔ ایسی مئے لاؤ جس سے مجھ پر کیف و مستی چھا جائے۔''

Marfat.com

مولانا جلال الدین رومی عالم دین تھے، مفتیٔ اعظم تھے، فقیہہ اور واعظ تھے، فتویٰ نویس تھے، دینی مدرسے کے مدرس اعلیٰ تھے، امام تھے، خطیب تھے..... لیکن مرشد کا حکم سننے کے بعد یہ سارے عہدے، سارے فرائض یکلخت فراموش کر گئے اور سیدھے قونیہ کے ایک ایسے محلے میں پہنچے جو یہودیوں کا قریہ کہلاتا تھا۔ وہاں شراب کی ایک دکان تھی۔ دو بوتل شراب کی خریدی اور اپنی چادر میں اچھی طرح چھپا کر تیز تیز قدم سے مرشد کی جانب چل پڑے۔ سامنے سے کوئی جوان عورت چلی آ رہی تھی۔ مولانا نہایت تیزی میں تھے چنانچہ اس سے ٹکرا گئے۔ بیچ چوراہے پر وہ بھی گرے، عورت بھی گری اور شراب کی بوتلیں بھی! اسی وقت وہ چادر جس سے وہ منہ پر بکل مارے ہوئے تھے، بدن سے الگ ہوگئی۔

لوگوں نے دیکھا کہ مشہور زمانہ مفتی اور عالم دین اس طرح سڑک پر گرے ہوئے ہیں کہ قریب میں نوجوان عورت بھی پڑی ہوئی ہے، شراب کی بوتل بھی پاس ہی ٹوٹی ہوئی ہے اور سڑک پر شراب بہہ رہی ہے۔ بدمستی کا یہ انوکھا منظر دیکھ کر راہگیروں نے خوب مذاق اڑایا، تالیاں بجائیں اور پھبتی کسی۔ بیچارے مولوی رومی شرمسار اٹھے اور سیدھے شمس تبریز کی خدمت میں پہنچے۔ ساری کیفیت بیان کی۔ آپ یہ ساری روداد سنتے رہے۔ پھر فرمایا:

> ''اے جلال الدین! آج تمہاری سلوک و معرفت، جذب و سکر اور صحو کی ساری منزلیں طے ہو گئی ہیں۔ میں نے تمہارے سامنے عورت، لڑکے اور شراب کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا، یہ ایک آزمائش تھی اور تم جس طرح اس میں پورے اترے ہو، اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج سے تمہیں وہ مقام حاصل ہو گیا ہے جس سے تمہارا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ لوگ تمہاری کتابیں قیامت تک پڑھتے رہیں گے اور میں دنیا میں گمنام ہو جاؤں گا، مگر تمہارے مرشد کی حیثیت سے پہچانا جاؤں گا۔''

گرچہ سلوک و معرفت کی دنیا میں مولانائے روم کو ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا، لیکن اردگرد کی فضا غصہ و غم سے معمور تھی۔ جہاں طلبا اپنے استاد اور اس کے پیر سے کبیدہ خاطر تھے، وہاں اہل خاندان بھی سخت ناراض تھے۔ ان میں مولانا کی اہلیہ کرا خاتون بھی تھیں۔ انہیں بھی اس بات کا صدمہ تھا کہ وہ شمس تبریز ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ آخر یہ دونوں بند کمرے میں کرتے کیا ہیں؟ اس سلسلے میں موصوفہ نے ایک واقعہ بیان کیا تھا جو کچھ اس طرح ہے:

Marfat.com

''وہ سردی کا زمانہ تھا۔ ہمارے گھر کے ایک کمرے میں میرے شوہر اور شمس تبریز خلوت گزیں تھے۔ میں دروازے کی دراڑ سے جھانک کر یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ دونوں کرتے کیا ہیں۔ اچانک کمرے کے پیچھے والی دیوار درمیان سے پھٹ گئی اور نورانی شکل وصورت کے چھ پیکر اسی دراڑ سے اندر داخل ہوئے۔ ان سراپائے نور ہستیوں نے جلال اور شمس کو سلام کیا اور ان کے سامنے پھولوں کا ایک گلدستہ رکھ دیا۔ پھر وہ سب خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ نماز فجر کا وقت آن پہنچا۔ تب ان منور نو واردوں نے شمس سے امامت کرنے کی درخواست کی، لیکن انہوں نے معذرت کر لی۔ تب امامت کا یہ اعزاز جلال کو بخشا گیا۔ انہوں نے یہ فریضۂ امامت اتنے اچھے، مؤثر انداز میں اور سادگی کے ساتھ انجام دیئے کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب نماز فجر ادا کر دی گئی تو یہ چھ کے چھ اجنبی افراد اسی روزنِ دیوار سے واپس چلے گئے جس سے وہ آئے تھے۔ ازاں بعد، جلال کمرے سے نکل کر سیدھے میرے پاس آئے۔ انہوں نے پھولوں کا گلدستہ مجھے پیش کرتے ہوئے کہا:

''ان کا خاص خیال رکھنا۔''

دوسرے دن میں نے گلدستے سے چند پھول نکالے اور عطر فروشوں کے بازار پہنچی تا کہ معلوم کروں کہ یہ پھول کہاں سے آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس طرح کے خوشبودار اور خوش رنگ پھول زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہر عطر فروش پھولوں کی تروتازگی، رنگت اور خوشبو سے سراپا ششدر تھا۔ اتفاق سے مصالحہ جات کا ایک ہندوستانی تاجر اس وقت وہاں موجود تھا۔ وہ ان پھولوں کو دیکھتے ہی چلا اٹھا:

''یہ پتیاں تو ایک خاص پھول کی ہیں جو صرف جنوبی ہند کے ایک خاص مقام میں پایا جاتا ہے۔ یہ تو نیہ میں کس طرح آ گیا ہے اور وہ بھی سردیوں کے شباب میں۔ ان کا یہاں کیا کام؟''

میں حیران وششدر گھر واپس آ گئی۔ جب میری نظر جلال پر پڑی تو وہ مجھے نہایت تاکید سے کہہ رہے تھے کہ ان پھولوں کی بھرپور انداز میں حفاظت کرو۔ یہ ایک گمنام جنتِ ارضی کے پھول ہیں جو مجھے تحفے میں دیئے گئے ہیں۔''

Marfat.com

احمد الافلاکی نے کرا خاتون کا یہ واقعہ اپنی مشہور کتاب ''مناقب العارفین'' میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

''کرا خاتون نے اپنی تمام عمر ان پھولوں کی دل و جان سے حفاظت کی۔ ان کی پتیاں علاج معالجے میں استعمال کی جاتیں اور اندھوں کی بینائی بحال کرنے میں کام آتیں۔ کرا خاتون کے پاس رکھے ہوئے یہ پھول اسی طرح تر و تازہ اور خوشبودار تھے جیسا کہ اس روز تھے جب روزن دیوار سے چھ نورانی شکل و صورت کے لوگوں نے کمرے میں آ کر شمس و جلال کو پیش کیے تھے۔''

یہ سب کچھ تھا مگر ظاہری علوم کے شیدائی شمس تبریزی سے متنفر ہو چکے تھے۔ اس نو وارد شخص نے قونیہ کی باغ و بہار شخصیت کو ان سے چھین لیا تھا۔ شہر کی طمطراق والی رونق ختم کر دی تھی۔ نہ اب جلوس نکلتا تھا، نہ وعظ کی مجلس جمتی تھی، نہ سلسلۂ درس و تدریس باقی رہا تھا۔ گویا شمس تبریزی نے ان کے رہنما مولانا رومی کو ہی نہیں چھینا تھا، حسنِ قونیہ بھی چھین لیا تھا۔ چنانچہ مرشدِ رومی کے خلاف رنجش بڑھتی گئی۔ معاندانہ رویے اپنائے گئے۔ تذلیل کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ حد تو یہ کہ خود مولانا رومی کا لڑکا علاء الدین محمد جب اپنے والد سے ملنے آیا کرتا تو اس خیمے سے ہو کر گزرتا جسے مولانا نے خاص شمس تبریزی کے لیے نصب کروائے تھے اور جہاں وہ فروکش تھے۔ اس طرح کی آمد و رفت سے ان کی عبادت و ریاضت میں خلل پڑتا۔ لیکن رومی کا متنفر بیٹا شمس تبریزی کے بار بار کہنے کے باوجود اپنی عادت سے باز نہ آیا اور اُلٹا ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔

اس طرح شورش پھیلتی چلی گئی، ہنگامہ بڑھتا گیا اور قونیہ کی فضا مکدر ہو گئی۔ شمس تبریز ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اللہ لوگ تھے۔ خلوص و محبت کے پیکر تھے۔ انسان دوستی کے پرچارک تھے۔ خونِ ابن آدم بہانے والوں میں نہ تھے۔ چنانچہ ایک دن نہایت خاموشی سے قونیہ سے چلے گئے، حتیٰ کہ اپنے چہیتے مرید مولانا رومی کو بھی بھنک نہ پڑنے دی۔

ان کا غائب کیا ہونا تھا، دلِ رومی پر قیامت گزر گئی۔ ان کی دنیا اجڑ گئی۔ شمس تبریز ایک بحر بے کنار تھے..... طریقت کے، معرفت کے، تصوف کے، علوم باطنی کے۔ ابھی مولانا نے اپنی اندرونی تشنگی بجھائی کہاں تھی کہ وہ بحر بے کنار ہی گم ہو گیا۔ رومی پیاسے رہ گئے اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے

Marfat.com

لگے۔ اپنے مرشد، اپنے معشوق، اپنے پیا کی جدائی میں باؤلے باؤلے سے نظر آنے لگے۔ نہ دن کو چین، نہ رات کو آرام! کُو بہ کُو اور قریہ بہ قریہ تلاش مرشد میں پھرنے لگے۔ اپنے مریدوں اور عزیزوں کو لے کر دمشق تک گئے۔ ہر طرف سراغ رسانی کی، لیکن پیر و مرشد کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

ایک ایسی شخصیت کا گم ہونا جس سے مولانائے روم کو دلی انسیت تھی، کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ عالمِ فرقت میں سخن سنجی کی دبی ہوئی چنگاری ابھر کر شعلۂ جوالہ بن گئی اور وہ فرقتِ محبوب میں شعر کہنے لگے۔ غزلوں پر غزلیں لکھ کر درد دل کی عکاسی کرنا ان کا شیوہ بن گیا..... اور یہ غزلیں کیا تھیں، فراق کے اذیت ناک لمحوں کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ یادِ معشوق میں تارے گن گن کر شب بسری کا دردناک نوحہ تھا..... یہ غزل پارے محض مولانا رومی کے دل محزوں کی ترجمانی نہیں کر رہے تھے، ہر سچے عاشق کا جیتا جاگتا المیہ تھے۔

اگر ہم چند لمحے کے لیے رک کر غور کریں تو مولانائے رومی کی آفاقی شاعری کا آغاز دراصل اسی لمحے ہو گیا تھا جب ایک بوریا نشیں اور گدڑی پوش فقیر نے ان سے معانقہ کیا تھا۔ اس سے قبل رومی سب کچھ تھے، شاعر تو نہ تھے۔ اور شاعری کی چنگاری اسی استادِ کامل کی روپوشی کے نتیجے میں ابھر آئی تھی۔ گویا شمس تبریز نے عشق حقیقی کی تعلیم خود اپنی ذات کو محور بنا کر دی تھی جس کے تانے بانے معشوق حقیقی کی ذات بے ہمتا سے مل رہے تھے۔ اور جب یہی ذاتِ ارضی گم ہوئی تو گویا فرقت کا شعلہ محض اسی پیکر آب و گِل کے لیے بھڑکا نہ تھا، ازلی روشنی کے لیے بھی تن و جاں کو تنور بنا گیا تھا۔

اور اسی عشق کے تنور میں ہمہ وقت جلتے رہنے کے نتیجے میں جس ''دیوان شمس تبریز'' کا آغاز ہوا، وہ ایسا مکمل شہ پارہ ہے، جس کی اپنی انفرادیت، اپنا رنگ، اپنا انداز اور اپنا حسن بیان ہے۔ لیکن مثنوئ رومی کے دھوم دھڑکے نے لوگوں کو اسی بحث میں الجھا کر رکھ دیا کہ

''یہ دیوان شمس تبریز کا ہے کہ مولانا رومی کا؟''

ہمارے ناقدوں نے فقیر منش تبریزی کو بھی شاعروں کی صف میں کھڑا کر دیا، محض اس بنا پر کہ مختلف غزلوں کے مقطع میں ''شمس'' بطور تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن دل کی آنکھ سے یہ نہ دیکھا کہ یہ محض عقیدت کا جذبہ تھا، انسیت کا رنگ تھا اور عشق کا کارنامہ تھا۔ شمس تبریز کا مشن تو دلِ رومی میں دبی

Marfat.com

ہوئی شعر وسخن کی چنگاری کو بھڑکانا تھا.....سو بھڑکایا اور روپوش ہو گئے۔

شمس تبریز کو یقیناً اس بات کا احساس رہا ہو گا کہ ان کی جدائی میں ان کے مریدِ صادق پر کیا گزر رہی ہو گی۔ بہت ممکن ہے کہ خود ان کے دل میں بھی رومی کی یاد کی لہریں متحرک ہو رہی ہوں..... اس لئے کہ عشق کی آگ ایک ہی طرف نہیں، دونوں جانب بھڑکتی ہے۔ ع

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

چنانچہ موصوفِ گم شدہ نے دمشق سے اپنی خیریت کا خط بھیجا تا کہ دلِ رومی کو تسلی ہو۔ نتیجتاً استاد کامل کا مکتوب پا کر مولانا کے دل کا کنول روشن ہو گیا۔ اپنے بیٹے سلطان ولد کو مرشد کے پاس اس انداز سے بھیجا کہ

- پیر کے آستانے پر نچھاور کیے جانے کے لیے ہزار دینار سرخ تھے۔
- منظوم خط تھا۔
- کئی عاشقانہ غزلیں تھیں۔

یہ چیزیں پا کر شمس مسکرائے۔ ان کی یہ مسکراہٹ نفسیاتی لحاظ سے بے حد معنی خیز تھی۔ یعنی عاشق کے دل میں لگی ہوئی آگ شعلۂ جوالہ بن گئی ہے..... اور شمس تبریزی کا مقصد بھی تو یہی تھا۔ اس کی تصدیق ان کے اس جملے سے ہوتی ہے:

''ان خزف ریزوں کی ضرورت نہیں۔ مولانا کا پیام کافی ہے۔''

پھر، شمس تبریز سلطان ولد کی ہمراہی میں واپس قونیہ آ گئے۔ یہ آمدِ بہارِ مجسم مولانا جلال الدین رومی کے لیے فرحت افزا ثابت ہوئی۔ ان کا اضمحلال ختم ہو گیا۔ ان کی کبیدہ خاطری روپوش ہو گئی۔ دل کی بے کلی جاتی رہی۔ اب وہ تھے، شمس تبریزی کا روحانی پیکر تھا اور عارفانہ سلسلۂ جنبانی!

لیکن وہی اعزہ واحباب جو رومی کی فرقتِ مرشد میں بے تابی و بے کلی کو دیکھ کر شمس تبریزی سے مخاصمت کرنے پر شرمندہ ہوئے تھے، وعدے وعید کیے تھے اور یقین دلایا تھا کہ اب ان دونوں کے معاملے میں وہ لوگ کچھ نہیں بولیں گے۔ مگر یہ عہدِ و پیمان عارضی ثابت ہوا۔ وہ پیر و مرید کی یکجائی پر پھر برافروختہ ہو گئے۔

آخر بار بار مخاصمت کا رویہ رومی خاندان والے کیوں اپناتے تھے۔ اعزہ واحباب فقیر تبریز سے کیوں بدکتے تھے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جانب مورخین نے غلط طریقے سے اپنی تجزیاتی توجہ مبذول کی ہے۔ کسی سوانح نگارِ رومی نے انسانی نفسیات کو دوران تجزیہ بروئے کار نہیں لایا ہے۔ آیئے، اس پہلو پر ایک نظر ڈال لیں۔

ذرا ملاقات شمس تبریزی سے پہلے کا ماحول دیکھئے۔ مولانا جلال الدین رومی اعلیٰ عہدے پر متمکن تھے۔ سلطان کیقباد کے شاہی مدرسے کے مدرس اعلیٰ تھے۔ حکومتِ وقت کے قاضی ومفتی تھے۔ واعظ تھے۔ ان کی مجلس میں آ کر بیٹھنے والوں میں بادشاہ وقت بھی تھے، افسران سلطنت بھی تھے، عمائدین شہر بھی! پھر بیرون شہر سے آنے والوں کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا..... یہ تفاخر، یہ شان، یہ طمطراق، یہ عزت واحترام، یہ رعب ودبدبہ صرف ملکیت رومی ہی تو نہ تھی، اہل خاندان کا بھی اس میں وافر حصہ تھا۔ مولانا رومی کا ہر اعزاز اعزہ کا اعزاز تھا۔ ان کی ہر قدر افزائی اہل خاندان کی قدر افزائی تھی۔ وہ جب قونیہ کے بازار سے گزرتے تو مولانا جلال الدین رومی کے عزیز ہونے کے ناطے ان کی عزت کی جاتی۔ ان کے لئے سرراہ آنکھیں بچھائی جاتیں۔ کیا کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔

مگر..... قونیہ میں شمس تبریزی کے ورود کے بعد ہر چیز بدل گئی۔ پہلے جیسا منظرِ طمطراق ہی نہ رہا۔ پوری ریاست کا عظیم وجلیل فرد ایک مجذوب کا حلقہ بگوش بن کر خود بھی مجذوب بن گیا تھا۔ ان تمام تغیرات کا بانی مبانی خواجہ شمس الدین تبریز کو سمجھا گیا تھا۔ لامحالہ انہی سے نفرت کی گئی اور ان کی دوسری آمد کے بعد دلوں کی کدورت اتنی بڑھی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قونیہ سے چلے گئے۔

شمس کے مستقلاً روپوش ہو جانے سے رومی کے اعزہ واحباب کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی..... مگر عارضی! اس لیے کہ مولانا کا پہلا جیسا دور پلٹ کر نہیں آیا، جس کے وہ لوگ متمنی تھے۔ لیکن یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ شمس تبریزی کی گمشدگی ہی مولانا جلال الدین رومی کو مولویٔ معنوی بنانے کا موجب ٹھہری۔ اگر یہ ملاقات نہ ہوتی، یہ انقلابِ حیات رونما نہ ہوتا تو مولانا رومی سب کچھ ہوتے، ''دیوان شمس تبریز'' کے خالق اور ''ہست قرآں درزبان پہلوی'' کہلانے والی مثنوی کے عظیم شاعر ہرگز ہرگز نہ ہوتے۔ بقول ان ہی کے:

Marfat.com

مولوی ہرگز نشد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نشد

(میں کبھی بھی مولانا روم نہ ہوتا اگر مجھ کو شمس تبریزی کی غلامی میسر نہ آتی۔)

شمس تبریز نے اپنے اس معنوی غلام کے سینے میں عشق کی جو چنگاری روشن کی تھی وہ شعلۂ جوالہ بنتی گئی۔ اس کو تیز تر کرنے میں کبھی شیخ صلاح الدین زرکوب کی معیت کارگر ثابت ہوئی اور کبھی حسام الدین چلپی کی رفاقت ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اس طرح بلخ کے جلال الدین شعر و سخن کی راہ طے کرتے ہوئے مولانا رومی کے روپ میں اس طرح جلوہ گر ہوئے کہ اب تک ان کا کوئی مدمقابل نہیں ہوا۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے مرا فرمایا ہوا

بہ حیثیت صوفیٔ باصفا

نویں صدی عیسوی کے ایک ممتاز ولی اور صوفیائے کرام کے سرخیل حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا:

''صوفی کی حیثیت زمین کی مانند ہوا کرتی ہے۔اس پر دنیا بھر کی غلاظت اور گندی اشیاء پھینک دی جاتی ہیں۔لیکن اِس سے صاف ستھری اور دلکش چیزیں ہی برآمد ہوتی ہیں۔''

حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ قول مبنی برحقیقت ہے۔یہ صوفی کی ذات ہے جو خیر کا منبع، اچھائی کا سرچشمہ، بنی نوع انسان کا غم خوار اور ہر کس وناکس کا خیر خواہ ہوتا ہے۔اس کا نورانی سراپا نسیم جاں فزا کے جھونکے کی مانند ہوتا ہے جو ہر اس چیز کو نہایت محبت آمیز اور شفقت خیز انداز میں مَس کرتا ہے جو اس کی راہ میں آ جاتی ہے۔اس میں من وتو کا شائبہ، امیر وغریب کا تفرقہ اور بلند وپست کا تصور جاگزیں نہیں ہوتا۔تصوف کی یہ بادِ بہاری ذات پات، رنگ ونسل اور فرقہ وقبیلے سے بے نیاز ہر بندۂ خدا کو مستفیض کرتی ہے۔

تصوف کے فرحت بخش جھونکوں سے بنی نوع انسان کو شاد کام کرنے والے یہ صوفیائے کرام اللہ رب العزت کے آخری نبی حضرت محمد مصطفٰے ﷺ کے آخری خطبے میں دی گئی تعلیمات پر سختی سے کاربند رہے اور دوسروں تک انہیں پہنچانے کے لیے ہر آن سرگرم عمل بھی رہا کرتے۔مذکورہ خطبۂ

Marfat.com

حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ نے فرمایا تھا:

''لوگو! میں تمہارے درمیان ایک چیز چھوڑے جارہا ہوں۔ اگر تم اسے سختی سے پکڑے رہو گے تو میرے بعد کبھی راستے سے بھٹک نہیں سکو گے۔ یہ چیز قرآن ہے۔

اے لوگو! اعمال میں خلوص وصداقت، مسلمان بھائیوں کے لیے بھلائی کا جذبہ اور آپس میں اتفاق..... یہ تین ایسی چیزیں ہیں جو دلوں کو پاک صاف رکھتی ہیں۔''

صوفیائے کرام نے اللہ کے آخری رسولؐ کے ارفع واعلیٰ فرمودات پر خلوص دل کے ساتھ عمل کیا اور آپؐ نے ہدایت کی جو ابدی شمع روشن کی تھی اس کی روشنی میں راہ حیات طے کرتے رہے۔ یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ اللہ کے یہ نیک صفت اور برگزیدہ بندے نہایت جوش وجذبے کے ساتھ قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا رہے اور وہ احادیث نبویؐ کو چراغ راہ بھی بنائے ہوئے تھے۔

اگر ہم صوفیٔ باصفا کے کردار کا تجزیہ کریں تو ان میں مندرجۂ ذیل خصوصیات بدرجۂ اتم پائیں گے:

☆ اپنی ذات کی نفی

☆ ہر آن تصوّرِ باریٔ تعالیٰ

☆ دنیاوی خواہشات سے بے نیازی

☆ زندگی کی صداقت سے پوری آشنائی

☆ ذہن ودل غیرِ حق سے پاک

☆ مزاج قلندرانہ

☆ نام ونمود سے گریز

☆ بنی نوع انسان سے محبت

☆ عجز وانکسار

☆ کسی امتیاز کی وجہ سے دوسروں پر اپنی برتری ظاہر کرنے سے گریز

☆ ہمہ تن عبادت وریاضت میں مصروفیت

☆ مراقبے کا تسلسل

☆ اورادووظائف کی پابندی

☆ انسان کی دل آزاری سے پرہیز

☆ محلاتِ شاہی اور دربارِ حکمرانی سے اجتناب

☆ قوتِ برداشت

☆ پُرسکون مزاج

☆ ہوائے نفسانی پر کنٹرول

☆ ہر مذہب اور فرقے کے لوگوں سے پیار

☆ دنیاوی حکمرانوں کے برعکس اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر یقین واعتماد

یہ تصوف ہی تو ہے جس نے من وتو کے بُت کو پاش پاش کر دیا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ تعصب کرنے سے گریزاں رہا ہے، شان وشکوہ کی جڑیں کاٹی ہیں اور دنیاوی جاہ ومرتبہ کے احساس کا قلعہ قمع کیا ہے۔ حد تو یہ کہ صوفی کی فقیرانہ بزم میں کوئی امتیاز روا نہیں، کوئی چھوٹا بڑا نہیں، محض اس لئے کہ اللہ کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ گویا وہ ہر معاملے کو رضائے الٰہی کے نظریے سے دیکھتا ہے۔ اس کا ''موٹو'' بس یہی ہے:

اپنی رضا وہی ہے جو ہے رضائے دوست!

اگر ہم کسی صوفیٔ باصفا کی خدمات، اس کے کردار، اس کے جذبے اور حسن کارکردگی کا مجمل انداز میں احاطہ کرنا چاہیں تو بس انشاءاللہ خاں انشا کے مندرجۂ ذیل اشعار اس کی عکاسی کر سکیں گے۔

جو چھوٹے چھوٹے پود لگائے تھے خیر سے
نامِ خدا ہوئے وہ سرِراہ کے درخت
الفت نہ ان سے کیوں کر ہمیں ہو کہ ہم غریب
اللہ کے فقیر یا اللہ کے درخت

یہ صوفیائے کرام اللہ کے فقیر ہی نہیں اللہ کے درخت بھی ہیں جو زمین کی غلاظت کو جذب کرتے ہیں اور اپنے وجود سے ہر شئے کو پُرنور بنا دیتے ہیں..... اور ہمارے مولانائے روم بھی ان ہی

Marfat.com

صوفیوں کی صفِ اولین میں ہیں جن کی ذات کی بدولت کوڑا کرکٹ سے لدی پھندی زمین سے گل بوٹے اُگے ہیں، سبزے نمایاں ہوئے ہیں، باد بہاری چلی ہے اور دلوں کو تروتازگی حاصل ہوئی ہے۔ آخر مولانا کو دنیائے تصوف میں اتنا باوقار مقام کس طرح حاصل ہوا؟ آیئے، اس کا جائزہ لیے لیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم ابتدائی ابواب میں مطالعہ کر چکے ہیں، مولانا جلال الدین رومی کے دادا حسین خطیبی بہت بڑے صوفی اور صاحبِ جلال شخص تھے۔ مولویٔ روم کے والد بہاء الدین ولد بھی سلوک وطریقت کے مرد میداں تھے۔ لیکن مولانا کو ان دونوں سے اس ضمن میں براہ راست کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ان کی پیدائش سے بہت قبل دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد بزرگوار نے انہیں ابتدا میں دینی تعلیم تو دی تھی، مگر اپنی بے پناہ مصروفیات کے سبب سلوک ومعرفت کے کوچے کی سیر نہیں کرا سکے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد اور مرید برہان الدین محقق کو بیٹے کا اتالیق اور استاد مقرر کر دیا تھا جنہوں نے مروجہ تعلیم تو دے دی تھی مگر صوفیانہ مسلک سے رومی کو آگاہ نہیں کر سکے تھے۔

جب مولانائے روم کے والد شیخ بہاء الدین ولد کا انتقال ہوا اور برہان الدین محقق (جو اس وقت اپنے وطن ترمذ میں تھے) یہ خبر سن کر قونیہ پہنچے تو پھر جو صورت سامنے آئی اس کا ذکر علامہ شبلی نعمانی نے اس طرح کیا ہے:

> ''قونیہ میں شاگرد استاد کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور دیر تک دونوں پر بے خودی کی کیفیت رہی۔ افاقے کے بعد سید نے مولانا کا امتحان لیا۔ جب تمام علوم میں کامل پایا تو کہا کہ 'علم باطنی رہ گیا ہے اور یہ تمہارے والد کی امانت ہے جو میں تم کو دیتا ہوں۔' چنانچہ نو برس تک طریقت اور سلوک کی تعلیم دی۔''

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ ایک طرح سے روحانیت کی ظاہری تعلیم تھی۔ مولانا کی راہِ طریقت کی جانب رہنمائی کر دی گئی تھی مگر انگلی پکڑ کر چلایا نہیں گیا تھا..... اس لئے کہ یہ اعزاز کسی اور کے نصیب میں تھا..... اور ان کا نام تھا شمس تبریز!..... ان کے پیر بابا کمال الدین جندی نے حکم دیا تھا:

> ''رُوم جاؤ۔ وہاں ایک دل سوختہ ہے، اس کو گرم کر آؤ۔''

یوں ظاہر ہوتا ہے کہ بدرالدین محقق نے نہاں خانۂ دلِ رومی میں عشق کی لکڑیاں جمع کر دی تھیں۔ ان کو چقماق سے روشن کرنا، آگ جلانا اور الاؤ تیار کرنا شمس تبریز کے مقدر میں تھا۔

Marfat.com

جب تبریز کے یہ مجذوب قونیہ پہنچے اور ملاقاتِ رومی وقوع پذیر ہوئی تو پھر..... تصوف کا رنگ مولانا پر ایسا چوکھا چڑھا کہ ظاہری سارے رنگ کافور ہو گئے۔ پہلے جیسا وہ طمطراق رہا نہ شان وشکوہ! گویا ہر چیز بدل گئی۔ صرف مجلس رومی ہی نہیں، پورا قونیہ ہی بدل گیا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

آخر آناً فاناً یہ کس طرح ہوا۔ ایک آن میں قبائے رومی اور دستارِ جلال کس طرح اتر گئی۔ کس طرح مسند فضیلت لپیٹ دی گئی اور بوریائے بوذرا اپنا لیا گیا۔ اس کا ایک راز ہے۔ آیئے، کچھ سراغ لگائیں۔

- علوم باطنی علوم ظاہری سے بالکل مختلف چیز ہے۔ آخر الذکر کا تعلق دماغ سے ہوا کرتا ہے، لیکن اول الذکر دل کے کلبۂ احزاں سے مربوط ومنسلک ہوتا ہے۔
- یہ وہ کوچۂ عارفانہ ہے جہاں نہ فلسفے کی دال گلتی ہے، نہ منطق کا جادو چلتا ہے اور نہ سائنس کی دسیسہ کاری کارگر ہوتی ہے۔
- ذرا یاد کیجئے مدینۂ منورہ کا وہ منظر جب اللہ کے پیارے رسولؐ نے اپنا روئے مبارک یمن کی طرف کر کے فرمایا تھا کہ ''مجھے یمن کی جانب سے محبت کی خوشبو آتی ہے۔''

یہی خوشبوئے محبت ہے جو علوم باطنی کی محرک بنتی ہے۔ اس سے دل کا گلستاں سرسبز وشاداب رہتا ہے۔

جب آنحضورؐ نے حضرت اویس قرنیؓ کا مفصل ذکر فرمایا تو صحابۂ کرامؓ نے آپؐ سے یہ دریافت کیا کہ کیا انہوں نے اللہ کے رسول کو دیکھا ہے؟ اللہ کے آخری پیغمبرؐ نے فرمایا:

''ظاہر کی آنکھ سے نہیں دیکھا، دل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔''

یہی دل کی آنکھ ہے جو زمان ومکاں سے پرے، سب کچھ دیکھ لیتی ہے، اس لئے کہ

بُعدِ منزل نہ شود در سفرِ روحانی

- پھر وہ واقعہ یاد کیجیے کہ مولانا جلال الدین رومی کی ہی جائے پیدائش بلخ کے عظیم وجلیل شہنشاہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ نصف شب کو اپنے شاہی محل کی چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ سنتے ہیں۔ دریافت کرنے پر غیبی آواز نے کہا تھا کہ ''میں اپنا اونٹ ڈھونڈتا ہوں۔'' اس پر حضرت ادھمؒ

Marfat.com

متعجب ہوکر بولے: ''چھت پر اور اونٹ؟'' جواب آیا: ''محل میں اور خدا؟''

پھر قارئین کو یہ حقیقت معلوم ہی ہے کہ دوسرے دن دربار میں کیا واقعہ پیش آیا[1]۔ بس، ایک ذرا سا ٹھوکا دیا گیا اور دنیائے دل اتھل پتھل ہوگئی۔ اس کے بعد، بلخ کے یہی بادشاہ جن کے جلوس کے آگے اور پیچھے خدام سونے کی چالیس چالیس تلواریں اور اعصائے سلطنت لے کر چلتے تھے، تصوف میں اس طرح ڈوبے کہ دریائے فرات کے کنارے پھٹی پرانی گدڑی سی رہے تھے۔ کسی نے طنزاً کہا کہ بلخ کی بادشاہت چھوڑ کر آپ کو کیا ملا۔ جواب میں آپ نے اپنی سوئی دریا میں ڈال دی۔ پھر فرمایا کہ میری سوئی واپس کر دے۔ معاً بے شمار مچھلیاں اپنے منہ میں سونے کی سوئی لئے ہوئے سطح آب پر آئیں۔ حضرت ابراہیم ادھمؒ نے فرمایا کہ یہ میری سوئی نہیں۔ مجھے تو لوہے والی اپنی سوئی چاہیے۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی مچھلی پانی کی سطح پر نمودار ہوئی۔ اس کے منہ میں حضرت ابراہیمؒ کی سوئی تھی۔ یہ دیکھ کر آپ نے اس شخص سے فرمایا:

''یہ ہے میری بادشاہت!''

یہ بادشاہت بڑے سے بڑے عالم، بڑے سے بڑے فاضل، بڑے سے بڑے فلسفی، حتیٰ کہ بڑے سے بڑے سائنس داں کو بھی میسر نہیں ہوئی۔ اور جو ہوئی تو ایک درویش بے نوا اور ایک صوفیٔ باصفا کو..... اس کی بیّن وجہ اللہ کا فرمان ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ○

یہ تسخیر کائنات انہی بوریا نشینوں کے لئے ہے اور اس کی جھلک ہم مولانائے روم کی اہلیہ کرا خاتون کے بیان کردہ واقعہ میں دیکھ چکے ہیں جب دیوار شق ہوئی، چھ نورانی پیکر در آئے اور پھولوں کا ایسا گلدستہ دیا مدتوں جس کی نہ رنگت زائل ہوئی، نہ خوشبو اڑی اور نہ تر و تازگی ختم ہوئی۔

☆☆☆

مندرجۂ بالا عبارتوں کے مطالعہ سے یہ بات قارئین پر واضح ہوگئی ہوگی کہ مولانا جلال الدین رومی سے قدرت کو جو ابدی نوعیت کا کام لینا تھا اور بنی نوع انسان کے دلوں کی جلا کے لئے ان کا جو کلامِ

---

1 تقدیم میں تفصیل درج کر دی گئی ہے۔

Marfat.com

بلاغت نظام درکار تھا......اس کے لیے مسندِ دانشوری نہیں، بوریائے بوذر چاہیئے تھا۔ اور یہ چیز گلیم پوش شمس الدین تبریزی نے فراہم کردی، اور اس طرح کردی کہ مولانا کا سراپا ہی بدل گیا۔ بقول علامہ شبلی نعمانی:

''مولانا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے تھے، ان کی زندگی عالمانہ جاہ وجلال کی شان رکھتی تھی۔ ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلباء، بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ مناظرہ اور مجادلہ جو علماء کا عام طریقہ تھا، مولانا اس میں اوروں سے چند قدم آگے تھے۔ سلاطین اور امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا۔ لیکن سلوک میں داخل ہونے کے بعد یہ حالت بدل گئی۔''

مولانائے روم اپنے مرشد تبریزی کے اس طرح حلقہ بگوش بن گئے تھے کہ

من تن شدم تو جاں شدی
من جاں شدم تو تن شدی!

صرف جان وتن کا ہی معاملہ نہ تھا، آدابِ پیر کا پاس ولحاظ بھی تھا۔ اور راہ سلوک ومعرفت میں آدابِ شیخ کی جو اہمیت ہے اُس جانب استاذی المحترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نقشبندی مرحوم نے یوں اشارہ کیا ہے:

''حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا ہے: اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ وَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ۔ یعنی ''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا۔ پس مجھے بہت ہی اچھا ادب سکھایا۔''
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سالک کے لئے آداب کی رعایت لازمی ہے۔ کوئی بے ادب منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ الآیہ (اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو اور ان سے اس طرح بے تکلفی کے ساتھ زور سے کلام مت کرو جس طرح ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔)

لہٰذا مرید کو چاہیے کہ پیر کا ؛ اب رکھے اور ذکر کی جو تعلیم وتلقین پیر اس کو بتلا دے، اس کا

پابند رہے اور اس کی نسبت یوں اعتقاد رکھے کہ جو فائدہ مجھ کو اپنے پیر سے پہنچ سکتا ہے وہ کسی اور بزرگ سے نہیں پہنچ سکتا اور جو فیض مرید کو پہنچے اس کو پیر ہی کے ذریعہ سمجھے۔"

مولانائے روم آداب شیخ کی اہمیت سے آگاہ تھے، لہٰذا تعلیمات تبریزی کی دل و جان سے پیروی کی۔ پیر کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہتے رہے۔ مرشد نے مولانا کو اپنے والد شیخ بہاءالدین ولد کی ان تصانیف کے مطالعہ سے منع کر دیا تھا جو ہمیشہ ان کو محبوب نظر رہیں۔ اسی طرح انہیں عربی زبان و ادب کے عظیم المرتبت شاعر المتنبی کی کتابیں پڑھنے سے بھی روک دیا تھا۔ مولانا بلا چوں و چرا اس حکم کی پابندی کرتے رہے۔

پھر، مولانا رومی کا کمرے میں بند ہو کر ذکر الٰہی میں مشغول ہونا، مجاہدے میں مصروف رہنا، پابندیٔ وقت کے ساتھ نماز پڑھنا..... یہ ساری باتیں پیر طریقت تبریزی کی رہنمائی میں انجام پاتی رہیں۔ اس کا ماحصل یہ ہوا کہ شمس نے انہیں روحانی قوت سے نواز دیا اور اس طرح کہ کبھی جوان عورت طلب کی، کبھی نوخیز طفل کی خواہش کی اور کبھی شراب کی فرمائش کی۔ مولانائے روم تمام آزمائشوں میں پورے اترے اور معرفت کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کر گئے۔

جب کوئی صوفی اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔ پھر ولی جو چاہے طلب کر لے، جو آرزو ہو پوری کر لے، جو خواہش ہو بروئے کار لے آئے۔ دنیا اس کی مٹھی میں سما جاتی ہے، ارض و سما اس کے لیے مسخر ہو جاتے ہیں اور وقت کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔ پھر یہ صورت ہوتی ہے کہ کرامتیں خود بخود ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں..... یہ خصوصیت اللہ لوگوں کی ہوتی ہے اور مولانائے روم اس سے مبرا نہ تھے۔ چند واقعات کے مطالعہ سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ منتہائے تصوف تک پہنچ چکے تھے:

- ہلاکو خاں کے سپہ سالار بائجو خان نے قونیہ پر حملے کا ارادہ کیا اور شہر کے چاروں اطراف میں اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ اہل قونیہ مولانائے روم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محاصرے کی وجہ سے پریشانی کا اظہار کیا۔ آپ نے ایک ٹیلے پر جو بائجو خان کے خیمے کے عین سامنے تھا، جا کر جانماز بچھا دی اور نماز پڑھنی شروع کر دی۔ سپاہیوں نے مولانا پر تیر برسانا چاہا۔ ان کی کمانیں کھنچ نہیں سکیں۔ ناچار ان کی طرف گھوڑے بڑھائے کہ قتل کر دیں، مگر گھوڑے اڑے رہے، آگے نہ بڑھ سکے۔

Marfat.com

- بائیجو خان خیمے میں تھا۔ اسے خبر دی گئی۔ وہ خیمے سے نکلا اور کئی تیر چلائے مگر سب ادھر ادھر نکل گئے۔ آخر وہ مولانا کی طرف پیدل چلا کہ جا کر کام تمام کر دے، لیکن پاؤں سو سو من کے وزنی ہو گئے۔ آخر محاصرہ ختم کر کے واپس چلا گیا اور قونیہ کے لوگ اس کی غارت گری سے محفوظ رہے۔
- کسی مجلس میں لوگ بڑی بڑی اور وزنی قسم کی موم بتیاں لے کر آئے۔ مولانا جلال الدین رومی بھی وہاں ایک ننھی منی سی موم بتی لیے ہوئے وارد ہوئے۔ لوگ ان کی معمولی سی موم بتی دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں ہنسے۔ اس پر آپ نے ان لوگوں سے کہا کہ اُن کی موم بتیاں اس ننھی منی موم بتی کی بدولت ہی روشن ہیں۔ وہ اس بات پر قہقہہ لگانے لگے۔ تب، جلال الدین رومی مسکرائے، چاروں طرف دیکھا اور پھر پھونک مار کر اپنی چھوٹی سی موم بتی بجھا دی۔ آناً فاناً ساری موٹی موٹی اور وزنی موم بتیاں بجھ گئیں اور پوری مجلس میں اندھیرا چھا گیا۔ چند ثانیے کے بعد آپ نے اپنی موم بتی جلائی۔ اس کا جلانا تھا کہ تمام لوگوں کی موم بتیاں روشن ہو گئیں۔
- ایک مرتبہ مولانائے روم کے ایک مرید نے مصر کے سفر پر جانے کا ارادہ کیا۔ اس کے دوستوں نے منع کیا، مگر وہ نہ مانا۔ یہ بات مولانائے روم کے علم میں لائی گئی۔ آپ نے بھی اسے سفر پر جانے سے منع فرمایا۔ مگر وہ مرید اپنی خواہش کو دبا نہ سکا اور ایک رات چپکے سے شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ انطاکیہ پہنچا تو ایک جہاز کے عملے میں شامل ہو گیا۔ پھر جہاز چل پڑا۔ اس کی بدقسمتی کہیے کہ جہاز کو قزاقوں نے گھیر لیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ مذکورہ مرید کو قیدی بنا دیا گیا اور اسے تہہ خانے میں ڈال دیا گیا۔ اس کو وہاں اتنی کم خوراک دی جاتی تھی کہ اس کا زندہ رہنا دشوار ہو گیا۔

یہ مرید زار و قطار رونے لگا اور مرشد رومی کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر اپنے آپ کو لعنت ملامت بھی کرنے لگا۔ چالیس کرب ناک ایام کے بعد ایک رات مولانا جلال الدین روی اس کے خواب میں آئے اور فرمانے لگے: ''کل چند کافر لوگ آئیں گے اور تجھ سے متعدد سوالات پوچھیں گے۔ ان کے ہر سوال کے جواب میں کہنا: ''میں جانتا ہوں۔'' اس طرح وہ تجھے آزاد کر دیں گے۔''

اگلے دن صبح چند فرنگی لوگ اس کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''ہمارا شہزادہ بیمار ہے۔'' یہ مرید بولا

’’ہاں مجھے علم ہے۔‘‘ انہوں نے کہا: ’’وہ یقیناً مر جائے گا۔‘‘ مرید نے جواب دیا: ’’میں جانتا ہوں۔‘‘ پھر انہوں نے پوچھا: ’’کیا تمہیں علاج معالجے کے بارے میں علم ہے؟‘‘ مرید نے کہا کہ ’’ہاں میں جانتا ہوں۔‘‘

ان لوگوں نے اسے تہہ خانے سے نکالا، اسے نہلایا دھلایا، اسے عمدہ پوشاک پہنائی اور اپنے بیمار شہزادے کے کمرے میں لے گئے۔ خدا نے اس مرید میں یہ بات ڈال دی کہ وہ کافروں کو سات قسم کے پھل لانے کے لئے کہے۔ پھر اس نے ان پھلوں میں کچھ جڑی بوٹیاں ملا کر دوا بنائی اور بیمار شہزادے کو کہا کہ وہ اسے پی لے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا علاج تیر بہدف ثابت ہوا اور شہزادہ روبہ صحت ہو گیا۔ اس نے کہا کہ جو خواہش ہو بتاؤ۔ مرید نے آزادی کی تمنا ظاہر کی۔ وہ اس طرح گھر واپس آ گیا اور مولانائے روم کے قدموں میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

مولانا رومی کے انتقال کے بعد مغل سپہ سالار کتھو خاں اپنی فوج ظفر موج لے کر قونیہ آ گیا تا کہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور یہاں کے باشندوں کو تہہ تیغ کر دے۔ اسی رات خان نے خواب میں دیکھا کہ مولانا رومی اس کے پاس آئے ہیں اور اس کا گلا دبا کر کہنے لگے: ’’قونیہ میرا ہے۔ تمہارا میرے لوگوں سے کیا کام؟‘‘

جب وہ جاگا تو دوزانو ہو کر معافی مانگی اور دوسرے دن اس نے قونیہ کے حکمراں کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور بہ حیثیت مہمان اندرونِ شہر داخل ہونے کی درخواست کی۔ حاکم قونیہ کو سخت حیرت بھی ہوئی کہ کہاں وہ ہمارے ملک پر یورش کرنے اور لوگوں کو ہلاک کرنے کی نیت سے آیا تھا اور کہاں یہ التجا! بہر حال، قاصد سے کہلوا دیا گیا کہ ہم بخوشیٔ دل آپ کا استقبال کریں گے۔

جب مغل سپہ سالار آیا تو حاکم قونیہ اور عمائدین شہر نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور بے شمار زر و جواہر نذر کئے۔ جونہی وہ سپہ سالار ایک مرصّع کرسی پر بیٹھا تو اپنے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکم قونیہ سے کہا:

’’تمہارے ساتھ والی کرسی پر کون بیٹھا ہے؟‘‘ یہ کہہ کر وہ مارے خوف کے لرزنے لگا۔

Marfat.com

اس کی یہ بات سن کر حاکم قونیہ نے کہا:

''اے خان اعظم! میرے ساتھ کوئی بھی تو نہیں ہے۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں تمہارے ہی پاس ایک کرسی پر ایک شخص کو بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ وہ لانبے قد کا ہے۔ اس کے چہرے پر داڑھی ہے۔ سر پر سبز رنگ کی پگڑی پہنے ہوئے ہے۔ اس کا جسم اونی چارخانے کی چادر سے ڈھکا ہوا ہے..... اور وہ مجھے نہایت خشمگیں نظر سے گھور رہا ہے۔'' یہ کہہ کر مغل فوج کا سالار اعظم تھر تھر کانپنے لگا۔

''اوہ! خان اعظم! یہ تو ہمارے معزز و محترم مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ یہ اسی علاقے میں مدفون ہیں۔''

خان اعظم نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا:

''اے حاکم قونیہ! میں نے رات خواب میں اسی حلیے اور رنگ روپ کے آدمی کو اسی لباس میں دیکھا تھا۔ وہ میرا گلا دباتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ قونیہ میرا ہے۔ تمہارا یہاں کیا کام..... اب میں یہاں سے فوراً جا رہا ہوں۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہاں سے پتھر کا ایک ٹکڑا اور مٹی کا ایک ڈھیلا بھی نہیں لے جاؤں گا۔''

اسی آن مغلوں کی فوج ظفر موج قونیہ کا محاصرہ اٹھا کر واپس لوٹ گئی۔[1]

---

1 قارئین گرامی! یہ اللہ لوگ بڑی روحانی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی رضا کے تحت اور جذبۂ ایمانی کے جلو میں جو کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں اس کا اشارہ علامہ اقبال کے اس شعر میں بخوبی مل جاتا ہے:

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

قونیہ کا مذکورہ واقعہ 1260ء کی آخری دہائی میں پیش آیا تھا۔ اس کے ٹھیک ایک سو سال بعد اسی نوع کا واقعہ ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی میں پیش آیا تھا۔ وہ زمانہ علاء الدین خلجی کا تھا۔ اور اسی زمانے میں سلسلۂ چشتیہ کے ممتاز رکن اور بابا صاحب پاک پتنؒ کے خلیفہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ اپنی خانقاہ میں موجود تھے۔ ایک روز بادشاہ کے بھیجے ہوئے تین آدمی آپ کے پاس اس کا پیغام لے کر آئے۔ ان میں حضرت کے مرید امیر خسروؒ بھی تھے جو دربار خلجی سے وابستہ تھے۔ بادشاہ نے یہ کہلوایا تھا کہ طغرل مغل اپنی فوج لے کر دلی آ پہنچا ہے اور اس شہر اور یہاں کے لوگوں کو خاکستر کر دینے والا ہے۔ بادشاہ کی زیادہ تر فوج حیدر آباد دکن کی یورش دبانے کے لیے وہاں گئی ہوئی ہے۔ دارالخلافہ میں بہت تھوڑے سے فوجی موجود ہیں جو طغرل کی فوج ظفر موج کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اب دعاء کا وقت ہے اور اس کی التجا آپ ہی سے ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ پیغام سنا، کچھ دیر توقف کیا پھر فرمانے لگے کہ بادشاہ سے کہہ دو کہ طغرل مغل کل فوج لے کر واپس چلا جائے گا۔ چنانچہ خلجی کا وفد واپس چلا گیا۔ (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجیے)

Marfat.com

یہ شمس تبریزی تھے جنہوں نے مولانائے روم کی کایا پلٹ دی تھی اور کچھ اس طرح کہ خود ان کے ساتھ رعونت آمیز انداز میں پیش آنے والے جلال الدین سراپا فقیر بن گئے تھے۔ ریاضت اور مجاہدے میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ مسلسل روزہ رکھنے لگے تھے اور اس طرح کہ دس دس بیس بیس دن کچھ نہ کھاتے تھے۔ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو چہرے کا رنگ مارے خوف الٰہی کے متغیر ہو جاتا۔ رات کے ابتدائی حصے میں نیت باندھتے اور دو رکعت ہی میں فجر کا وقت آن پہنچتا۔ شب خوابی کے لباس سے بے نیاز، بستر اور تکیے سے بے نیاز، نیند سے بے نیاز اور آرام سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اگر نیند کی شدت ہوتی تو دوزانو ہو کر تھوڑی نیند لے لیتے..... پھر وہی ریاضتِ شاقہ!..... وہ اس طرح اپنے رب کے حضور کھڑے ہوتے کہ سارا بدن تھر تھر کانپنے لگتا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

کوچۂ تصوف میں قدم رکھنے کے بعد مولانا جلال الدین رومی کی ہیئت جس طرح تبدیل ہوئی تھی اور ان میں درویشی کی خاصیت جس طرح پیدا ہو گئی تھی، اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ پچھے صفحے کا)

کچھ ہی لمحے بعد آپ کھڑے ہو گئے۔ پھر بیٹھ گئے۔ پھر کھڑے ہوئے اور بیٹھے۔ تیسری مرتبہ پھر کھڑے ہوئے اور بیٹھ گئے۔ حاضرین میں سے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ بادشاہ کا پیغام سننے کے بعد میں نے اپنے پیر بابا فریدؒ کی طرف توجہ کی اور نہایت اعتماد سے طغرل کی واپسی کا مژدہ سنا دیا۔ پھر میں نے اجودھن کا کتا دیکھا۔ میں اس کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ وہ تین مرتبہ آیا اور میں بھی اُس کے احترام میں تین بار کھڑا ہوا۔ مجھے بشارت مل گئی کہ مغل فوجی کتے ہیں، چلے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ نے مجلس میں موجود اپنے ایک مغل مرید کو قریب بلا کر فرمایا کہ میرا یہ رومال لے کر طغرل کے پاس چلا جا۔ اسے میری طرف سے سلام کرنا اور کہنا کہ یہ رومال چہرے پر رکھے، پھر جو کچھ نظر آئے وہ بتائے۔ چنانچہ مغل مرید رومال لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں اسے کسی نے بھی نہیں روکا۔ وہ مغل فوجیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا طغرل تک پہنچ گیا اور اسے رومال دیا۔ اس نے منہ پر رکھ لیا۔ کافی دیر رکھنے کے بعد، جب ہٹایا تو اس کا چہرہ خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے برجستہ کہا:

> ''میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے دلی میں بیٹھے بیٹھے میرے ملک کی سیر کرا دی۔ میرا ایک دشمن فوج لے کر میرے دارالخلافہ کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ میری رعایا مجھے پکار رہی ہے اور اجودھن سے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ حکم دے رہے ہیں کہ طغرل واپس چلا جا۔ طغرل واپس چلا جا۔ اب میں اپنا محاصرہ اٹھا کر واپس اپنے ملک جا رہا ہوں۔ اور یہ رومال ایک تبرک سمجھ کر لیے جا رہا ہوں۔''

دوسرے دن صبح ہی صبح دلی میں یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ طغرل مغل کی فوج واپس جا رہی ہے۔ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی دعا مستجاب ہو چکی تھی۔ (ملاحظہ ہو ''نظامی بنسری'' مطبوعہ دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد)

قونیہ کی ایک شاہراہ پر دو شخص گالم گلوچ میں مصروف تھے۔ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا:

''اولعین! تو ایک کہے گا تو مجھ سے دس سنے گا۔''

اتفاق سے مولانائے روم اس راستے سے گزرے۔آپ نے اس شخص سے کہا کہ ''اے برادر! تمہیں جو کچھ کہنا ہے، جو گالی دینی ہے، جو لعن طعن کرنا ہے، جو کچھ کوسنا ہے، مجھ کو مخاطب کر کے کہہ لو۔مجھ کو تم ہزار صلوٰۃ سناؤ گے تو بدلے میں ایک بھی نہ سنو گے۔''

ہزار صلوٰۃ سننے کے بعد بدلے میں ایک جملہ بھی نہ کہنے والا صوفیٔ باصفا اور ولیٔ کامل نہ ہوگا تو دوستو، وہ پھر کیا ہوگا؟ اور مندرجۂ ذیل نظریے کے حامل شاعر کو ہم کیا کہیں گے؟

اے خنک جانے کہ عیب خویش دید
(قابل تعریف ہے وہ شخص جو اپنا عیب دیکھے)
ہر کہ عیبے گفت آن برخود گزید
(جو کوئی عیب بتائے، اپنے لئے تسلیم کر لے)

زانکہ نیمے اُو ز غیبستان بدست
(کیونکہ اس کا آدھا عیبوں کی دنیا کا ہے)
وان دگر از روئے زغیبستان بدست
(دوسرا (آدھا) عالم غیب کا ہے)

چونکہ برسَر مر ترا صد ریش ہست
(چونکہ تیرے سر پر سو زخم ہیں)
مرہمش برخویش باید کار بست
(ان کا مرہم اپنے اوپر لگانا چاہیے)

عیب کردن ریش را داروئے اوست
(زخم کو برا سمجھنا ہی اس کا علاج ہے)
چون شکستہ گشت جائے ارحمو است
(جب خاکسار بن گیا ارحمو کا حامل ٹھہرا)

Marfat.com

لا تخافو از خدا نشیندۂ [1]

(تونے تو خدا سے لاتخافو نہیں سنا ہے)

پس چہ خود را ایمن و خوشدیدۂ

(پھر اپنے آپ کو کیوں مطمئن اور اچھا سمجھتا ہے)

اور یہ صوفیائے کرام نہ کبھی مطمئن ہوئے اور نہ اپنے آپ کو اچھا سمجھا۔ مولانا جلال الدین رومی بھی ان ہی میں ایک تھے۔ ان ہی اوصافِ ولی اللّٰہی کا نتیجہ تھا کہ جب مولانائے روم کا جسد خاکی تدفین کے لئے اس جگہ لایا گیا جہاں آپ کے والد ابدی نیند سو رہے تھے تو اپنے ہی بلند مرتبت صوفی بیٹے کے استقبال کے لیے آپ اپنی قبر سے باہر آ گئے۔ ممکن ہے قارئین کو اس واقعہ پر اعتبار نہ آئے اور اسے ذہنی اختراع اور عقیدت کیشی کا ایک ڈھونگ سمجھ لیا جائے..... مگر قونیہ کا ہر باشندہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے اور اسے مولانائے روم کا ایک معجزہ سمجھتا ہے..... ٹھیک اسی طرح جب آپ نے حملہ آور مغل سردار کشو خاں کا گلا دبایا تھا، حالانکہ مولویٔ معنوی کے انتقال کو عرصہ ہو گیا تھا۔

---

1 قرآن مجید میں اللہ کے کامل اور مومن بندوں کے لیے آیت آئی ہے۔ لَاتَخَافُوْ وَلَا تَحْزَنُوا۔ اللہ رب العزت نے کامل مومنوں سے یہ بات کہی ہے۔ مولانا رومی کا خطاب عام مسلمانوں سے ہے۔

Marfat.com

بہ حیثیت شاعرِ ہمہ رنگ

اردو کے نامور غزل گو ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ایک شعر ہے ۔

دل پر چوٹ پڑی ہے تب تو آہ لبوں تک آئی ہے
یوں ہی چھن سے بول اٹھنا شیشے کا دستور نہیں

اگر ہم اس شعر کو حیاتِ رومی پر منطبق کریں تو صداقت سامنے آ جائے گی۔ طالب علمی کے کسی موڑ پر انہوں نے شعر نہیں کہا، جوانی میں بھی سخن سنجی سے دور رہے، حتیٰ کہ تعلیم و تدریس کے دوران بھی، جب وہ ادب کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالتے تھے، شعر گوئی سے انہیں سراسر اجتناب رہا۔ بات دراصل یہ تھی کہ دلِ رومی پر کوئی چوٹ نہیں پڑی تھی، اسے کوئی دھچکا نہیں لگا تھا، کسی قسم کی آنچ نہیں آئی تھی۔ وہ ان تمام آلام سے مبرّا تھے۔ انہیں دنیاوی جاہ و حشمت حاصل تھی۔ عزت و تعظیم میسر تھی۔ کُرا خاتون جیسی خوبصورت عورت رفیقۂ حیات تھیں۔ دو معصوم اور خوبصورت بیٹے اللہ نے دے رکھے تھے۔ عہدہ و اعزاز تھا۔

یہ سارے لوازمات سخن سنجی کے لیے متحرک ثابت نہیں ہوتے اور ذوقِ شعر گوئی کو مہمیز بھی نہیں کرتے۔ بھرتی کے شعر کہنا ہر ہما شما کا کام ہے۔ لیکن دل پر چوٹ لگانے والے اشعار..... یہ تو عطّار و

Marfat.com

حافظؔ، انوریؔ وخاقانیؔ اور خیامؔ وخسروؔ کا عطیۂ بے بہا ہے۔ اوران ہی میں مولانائے رومؔ بھی شامل ہیں۔ مگر کس طرح اور کیوں کر؟

وہ ایک فقیر بے ریا تھا، وہ ایک درویش خدا مست تھا اور وہ ولیٔ باصفا تھا جس کے عشق میں مولانائے مسند نشیں گرفتار ہوئے۔ جس کی محبت کی چنگاری نے ان کے تن بدن میں آگ لگادی۔ جس کی الفت کے شعلوں نے جامۂ حریر وپُرنیاں اور دستارِ فخر وامتیاز کو جلا کر بھسم کر دیا..... اور جب یہ مرکز عشق ومحبتِ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، جب یہ محورِ شوق وولولہ نظرِ رومی سے روپوش ہوگیا، جب معشوقِ جلال داغِ مفارقت دے گیا اور وسیع وعریض کائنات میں گم ہوگیا..... پھر مولویٔ معنوی کے دل پر چوٹ پڑی اور..... آہ وفغاں اشعار بن بن کر لبِ رومی پر رقص کناں ہوگئے۔

اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ قدرت نے ان کے خمیر میں سخن سنجی اور شعر گوئی کی صلاحیت پیوست کر دی تھی، مگر یہ عطیۂ خداوندی ایک طویل عرصے تک جلال الدین رومی کے نہاں خانۂ دل اور احاطۂ ذہن میں مخفی رہا۔ اسے اُبھر کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یعنی صلاحیتِ شعر گوئی موجود تھی، مگر..... اسے ''چوٹ'' لگ کر نمایاں ہونے کا لمحہ میسر نہیں ہوا تھا۔

بلاریب، یہ شمس تھے جو سخن سنجیٔ رومی کے محرک بنے۔ بہ فرض، وہ نہ ہوتے اور شاعری کی ودیعت شدہ صفت کبھی نہ کبھی جان وتن رومی میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھتی تو وہ شاعر بن جاتے، ہزاروں شاعروں کی طرح! مگر انہیں ''دیوان شمس تبریز'' کے خالق کے طور پر اور ''مثنویٔ معنوی'' کے عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے وہ مقام ہرگز، ہرگز حاصل نہ ہوتا، جو گمشدگیٔ معشوق کی بدولت حاصل ہوا۔

یہ کوئی ''جنسی عشق'' نہ تھا، یہ چاند میں نظر آنے والی میر تقی میر کی معشوقہ کا عشق نہ تھا، یہ غالب کی ''جھروکے والی'' کا عشق نہ تھا، یہ مصحفی کی ''مصحفن'' والا عشق نہ تھا..... مولانا رومی کا یہ عشق، عشق مجازی نہیں، عشق حقیقی تھا۔ اور شمس تبریز ایک وسیلہ تھے اَللّٰہُ جَمِیْلٌ تک پہنچنے کا۔ وہ ہاتھ میں معرفت کا چپو لیے اس کشتی کو کھے رہے تھے جو رومی کا مقدر بن چکی تھی اور جس کی منزل..... قرب الٰہی تھی! قدرتِ خداوندی نے شمس الدین تبریزی کو ایک وسیلۂ بنایا تھا، ہزارہا پیران طریقت کی مانند اور جب دلِ رومی میں عشق کی آگ بھڑک اٹھی تو وہ چپکے سے کھسک گئے۔ ان کا مقصد قونیہ میں مستقلاً قیام تھا ہی نہیں۔ وہ تو اپنے مرشد طریقت، بابا کمال الدین جندی کی واضح ہدایت پر دلِ رومی کو سوختہ کرنے آئے تھے۔ سو،

Marfat.com

شعلۂ عشق بھڑکایا اور چلتے بنے۔

اگر ہم تصوف کی تاریخ کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو ایسی مثالیں ان گنت ملیں گی۔ مخدوم الملک شیخ شرف الدین منیریؒ (مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی کے مصنف) پیر کی تلاش میں بہار شریف سے نکلے اور پورے ہندوستان کی خاک چھانتے ہوئے دلی پہنچے۔ حضرت خواجہ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ آپ نے مخدوم کو دیکھ کر فرمایا:

''سیمرغ است، ولے نصیب دام ما نیست''

جناب مخدوم نے حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتیؒ سے جا کر ملاقات کی۔ آپ کو دیکھتے ہی قطب وقت نے کہا:

''شیخ است۔ اما مغلوب الحال است۔
تربیتِ دیگرے نمی پروازد۔''

وہاں سے بھی محروم ہو کر مخدوم شرف الدین منیریؒ شیخ نجیب الدین فردوسیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کہنے لگے کہ ''کب سے تمہاری امانت کی حفاظت کر رہا ہوں۔'' پھر بیعت لے کر فوراً انہیں واپس کر دیا۔ ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ راستے میں کوئی اہم خبر ملے تو ہرگز واپس نہ لوٹنا۔ مخدوم شرف الدینؒ ابھی راستے ہی میں تھے کہ مرشد کے انتقال کی خبر ملی۔ حکم تھا، لہٰذا واپس نہ لوٹے۔ اور آہ و بکا کرتے ہوئے گھنے جنگل میں بارہ سال کے لئے گم ہو گئے ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

اور جب ریاضتِ شاقہ کے بعد نکلے تو کندن بن چکے تھے۔

یہی حال ہمارے مولانا رومی کا ہوا۔ اہلِ قونیہ کا اذیت ناک رویہ شمس تبریز کے لئے محض ایک بہانہ تھا۔ اگر یہ واردات نہ بھی ہوتی تو انہیں تبریز واپس جانا ہی تھا۔ اور اگر نہ جاتے تو پھر دنیائے ادب

Marfat.com

مولانائے روم جیسے عظیم شاعر سے ابدلآباد تک کے لئے محروم رہتی۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا، دلِ رومی پر چوٹ پڑنے سے سخن سنجی کے پوشیدہ تار ایک دم جھنجھنا اٹھے۔ پیر کی جدائی کی بنا پر مولانا کے دل میں جذبات کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسی جذبے نے ان کے دل میں شاعری کا ولولہ پیدا کر دیا۔ اپنے محبوبِ صادق کے فراق میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر مولانائے روم اشعار کہنے لگے..... نہایت ولولہ انگیز، حد درجہ درد آمیز، بے حد مسحور کن اور بے انتہا رقت خیز! قبل اس کے کہ ہم بابِ ہذا کے عنوان کے تحت مولانا جلال الدین رومی کی ہمہ رنگ شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیں، ایک غلط نظریے کی وضاحت اور اس کا سدباب ضروری سمجھتے ہیں۔

مولانا رومی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے کتابیں لکھنے والے مصنفین نے آر۔اے۔ نکلسن کے اس نظریے کو آمنّا وصدقنا کہہ کر قبول کر لیا ہے کہ جب شمس تبریزی کے خلاف ایک شورش پیدا ہوئی اور نیاز مندانِ رومی نو وارد درویش سے بے حد کبیدہ خاطر ہو گئے تو مولانائے روم گڑگڑا گڑگڑا کر، آنسو بہا بہا کر، دل کو مسوس کر کر کے اس نوع کے ''طفلانہ''[1] شعر اپنے مرشد کے روبرو کہنے لگے:

بشنیدہ ام کہ عزم سفر میکنی مکن
مہر حریف و یار دگر میکنی مکن
تو در جہان غریبی و غربت ندیدہٖ
قصد کدام خستہ جگر میکنی مکن
ای مہ کہ چرخ زیر و زبر برای تست
ما را خراب و زیر و زبر میکنی مکن

(میں نے سنا ہے کہ آپ عازم سفر ہونے والے ہیں۔ یعنی آپ ایک نئے شخص کو مرکز محبت بنانے والے ہیں، اگرچہ اس دنیا میں آپ کی ذات باعثِ حیرت و استعجاب ہے لیکن آپ نے کبھی کشیدگی اور رنجش نہیں دیکھی۔ پھر آپ دل کو لرزہ براندام کر دینے والا طرزِ عمل کیوں اختیار کر رہے ہیں۔ اے مہتاب! یہ آسمان آپ ہی کو دیکھ دیکھ کر..... حیران و ششدر ہے۔

1 یہ اصطلاح علامہ شبلی کی ہے۔

پھر مجھے بھی اپنے فراق کے احساس سے آپ حیران وششدر کیوں بنانا چاہتے ہیں۔)

ان اشعار کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجرۂ تصوف میں، جہاں پیرومرشد، عاشق و معشوق اور محبّ ومحبوب ہمہ وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہتے اور معرفت کی منزلیں طے کرتے رہتے، وہاں شعروشاعری کا ذکر بھی رہتا تھا اور رومی رو رو کر پیر سے رخت سفر نہ باندھنے کی التجا کرتے رہتے..... حیرت کی بات یہ ہے کہ نکلسن کی اس بات کو بہتیرے رومی شناس مصنفوں نے تسلیم کر کے مولانائے روم کے منہ کو فراق تبریزی سے قبل ہی شعروسخن کی لذت سے آشنا کر دیا ہے۔ حالانکہ بات ایسی نہ تھی۔

نکلسن جو فقط مترجم رومی ہیں، سے ہم اپنی توجہ ہٹا کر جب موجودہ دور کی ایک نامور محقق کی جانب رجوع کرتے ہیں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ اور یہ جرمن نژاد خاتون ڈاکٹر این میری شیمل ہیں جو پورے چالیس سال تک مطالعۂ رومی اور تحقیق رومی میں غرق رہیں، برملا یہ کہتی ہیں:

> ''شمس تبریز کی پہلی گمشدگی کے نتیجے میں ہی مولانائے روم فن سخن کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ شاعر بن گئے، موسیقی سننے لگے، رقص کرنے لگے اور گانا گانے لگے۔''

اس نکتے کی وضاحت علامہ شبلی نعمانی نے بھی کی ہے۔ ان کی گراں قدر تصنیف ''شعرالعجم'' ہی اس بات کی ضامن ہے کہ وہ مولانائے روم پر اوروں کی بہ نسبت زیادہ وقیع رائے کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے:

> ''شمس سے ملاقات سے پہلے مولانا کے شاعرانہ جذبات اسی طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ شمس کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے ان کی پُرجوش غزلیں۔''

قارئین! آپ خود فیصلہ کرلیں کہ نکلسن کے منقول اشعار رومی کہ ''اے میرے مرشد! آپ مجھے چھوڑ کر نہ جایئے۔'' طفلانہ ہی نہیں، غیر منطقی، غیر نفسیاتی اور غیر تاریخی بھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رومی کی شعرگوئی کے پتھر پر فراقِ تبریزی ہی چقماق بن کر گرا تھا نہ کہ ان کے قونیہ سے جانے کی اڑتی پڑتی اور غیر یقینی خبر! واضح رہے کہ شمس کچھ کہے بغیر، مطلع کئے بغیر ہی چلے گئے تھے..... آناً فاناً! اور مریدو محبّ رومی کو ان کے غائب ہو جانے کا کچھ اس درجہ صدمہ ہوا کہ فراق محبوب میں نغمے الاپنے لگے۔ اور

مذکورہ بالا اشعار ''دیوان'' میں مندرج ایک غزل کے ہیں جو یقیناً گمشدگیٔ تبریز کے بعد طوفانِ آمدِ شعر کے نتیجے میں کہے گئے ہیں۔

بہرحال، شمس تبریزی رخصت ہو گئے اور مولانا رومی فراقِ محبوب میں شاعر بن گئے، ایسے کہ آٹھ سو سال گزرنے کے بعد بھی ان کا کوئی نعم البدل بساطِ عالم پر ہویدا نہیں ہوا۔ فراقِ یار کا یہ وہ دور ہے جب رومی کے اولین اشعار صفحۂ قرطاس پر رقم ہونے لگے اور ''دیوان شمس تبریز'' کے گُل بوٹے سجنے لگے۔ ابتدائی لمحات میں موزوں کردہ اشعار جس نوعیت کے تھے، اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ سارا کلام اپنے محبوب مرشد کی جدائی میں مولانا نے موزوں کیے تھے جو پھیلتے پھیلتے تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہوئے اور ''دیوانِ شمس تبریز'' کی زینت بنے ؎

بروید ای حریفان بکشید یار مارا
بمن آورید حالا، صنم گریز پارا
اگر او بہ وعدہ گوید کہ دم دگر بیاید
مخورید مکر او را بفریید او شمارا
بہ بہانہ ہائے شیرین بہ ترانہ ہائے موزون
بکشید کوئے خانہ مہ خوب خوش لقارا

(اے دوستو! جاؤ اور اصرار کر کے میرے محبوب کو لے آؤ۔ تم لوگ فی الفور چلے جاؤ اور میرے حیلہ جو معشوق کو ساتھ لیئے ہوئے آ جاؤ۔ اگر وہ اس قسم کا وعدہ کرے کہ بعد میں کسی وقت آ جائے گا تو تم لوگ اس مغالطے میں ہرگز مت پڑنا اور نہ ہی اس کے فریب میں آ جانا۔ اے دوستو! جاؤ اور اس مرکزِ حسن و جمال کو میرے کلبۂ تاریک میں لے آؤ۔ ہاں، اس سے درخواست نہایت لجاجت سے کرنا اور نہایت متانت آمیز انداز و بیان اختیار کرنا۔)

قارئین! ذرا توقف کر کے صفحہ 82 پر نکلسن کے منقولہ اشعار[1] کو دیکھئے اور مذکورہ بالا تین اشعار پر نظر ڈالئے۔ آپ خود اندازہ کر لیں گے کہ کذب و افترا کیا ہے اور حق و صداقت کیا ہے۔ محولہ بالا

---

1 میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہ اشعار رومی کے نہیں ہیں۔ رومی کے ہی ہیں، مگر یہ کہنا کہ شمس تبریز کو مخاطب کر کے سنایا گیا، سراسر غلط ہے۔ مولانا کی شعر گوئی کی ساری کڑیاں ہی ہل جاتی ہیں۔

غزلیہ اشعار ہی اُس شاعر کی شاعری کا حسین آغاز کر رہے ہیں جس نے تمام دنیا کی شاعری میں اپنے خاص تیور، منفرد انداز اور اثر انگیز لہجے سے ارفع و اعلیٰ مقام بنالیا ہے۔ یہاں رومی بظاہر تو مجازی عاشق نظر آ رہے ہیں، مگر در پردہ وہ عشقِ حقیقی کی جلوہ سامانیوں کو نہایت جذب و انہماک کے ساتھ یوں پیش کر رہے ہیں کہ قاری خود اپنے دل کو سنبھال نہیں پاتا۔

غزل جس کا خمیر ہی عشق و محبت کے مسالے سے گوندھا گیا ہے اور جس کے انداز بیان میں حرماں نصیب عاشق کی تڑپ اور اضطراب بخوبی عیاں ہو جاتا ہے..... مولانا رومی کے یہاں اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ انگڑائی لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر مصرع، فراق یار کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے اور ہر شعر عاشقِ مہجور کی بے تابی کی جلوہ کشی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، رومی نے صفحۂ قرطاس پر اپنا تڑپتا ہوا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

''دیوان شمس تبریز'' صحیح معنوں میں غزلیات کا سبدِ گُل ہے۔ جو حضرات صنفِ غزل کے حسن، لطافت، پاکیزگی، اثر انگیزی اور دل کو جھنجھوڑنے والے اوصاف سے بخوبی آشنا ہیں، وہ اس دیوان کو فارسی ادب کا طرۂ امتیاز قرار دینے پر ہر طرح آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مولانا رومی نے جو شعر بھی موزوں کیا ہے، وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبل کر ہی سامنے آیا ہے۔ اس میں سفلی جذبات کی نہ کوئی آمیزش ہے اور نہ ہی حیوانی جبلت کی عکاسی!..... یہ پورا مجموعۂ کلام عاشقِ صادق کے روح پرور جذبات کا آئینہ دار ہے اور اس میں انسانیت کا آفاقی رنگ نمایاں ہے۔

مولانا کا تغزل منفرد بھی ہے اور معنویت آمیز بھی! انہوں نے اس صنف سخن کو لفظی لحاظ سے بھی ترقی کی جانب گامزن کیا اور معنوی لحاظ سے بھی اسے آراستہ و پیراستہ کیا۔ ان کا کلام صحیح معنوں میں ہمہ رنگ صفات کا آئینہ دار ہے۔ لطافت معنی، باریکیٔ خیال، سخن سنجی کی پختگی اور عرفان فکر کی بلندی کی بدولت انہوں نے تغزل کو اوج کمال تک پہنچا دیا..... اور اسے ہر صورت میں منتہائے غزل گوئی قرار دے دیا۔ آپ فارسی کے تمام اساتذہ شعراء کے کلام کا مطالعہ کر جایئے۔ ان کے انداز بیان، فکر کی گہرائی اور لب و لہجے کی انفرادیت سے یقیناً متاثر ہوں گے، لیکن جو خوبیاں، جو باریکیاں، جو رعنائیاں اور جو اچھائیاں مولانا جلال الدین رومی کے یہاں آپ کو نظر آئیں گی، وہ بس ان ہی کی دین ہے، ان ہی کا عطیہ ہے اور ان ہی کا حرف آخر بھی!

مولانائے روم کی شاعری ہمہ رنگ، ہمہ موضوع اور ہمہ صفت ہے۔ اسے ہم رسائیِ مقصود، اتفاقِ مطلب، لطافتِ معنی، باریکیٔ خیال، فکرِ عرفانی کی صفائی اور پختگی کی شاعری قرار دینے پر مجبور ہیں۔ یہ سراسر شور وشوق کا مظہر اور ولولہ انگیز جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں نہ تصنع کا شائبہ ہے، نہ چربے کا وہم وگمان! یہ سراسر خلاقیت کا پرتو، ذہنی اختراع کا نمونہ اور تپشِ دل کی آنچ ہے کہ قاری اس وادیٔ بیکراں میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اسے خود اپنا وجود اس میں ضم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

مولویٔ معنوی کی شور انگیز غزل گوئی کا مرکز ومحور وصالِ حق بھی ہے اور وجود مطلق کا ادراک بھی! ہر غزل کا ہر شعر ہجر وفراق کی داستان اور عشقِ محبوب کا سلگتا ہوا شعلہ ہے۔ تصورِ معشوق کا وجد آفریں ساز اس طرح چھڑتا ہے کہ پوری کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ رقص کناں نظر آنے لگتا ہے۔ اور جب فراقِ یار کا نعرۂ مستانہ بلند ہوتا ہے تو سننے والے کا کلیجہ چھلنی چھلنی ہونے لگتا ہے۔ گویا کلامِ رومی میں جذبات کی صداقت، فکر کی گہرائی اور عشق کی تمازت کچھ اس طرح رچی بسی ہے کہ یہ ''چیزے دیگر است'' کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے۔

پھر، موضوعات کے تنوع نے مولانائے روم کی شاعری کو بیاباں کی وسعت، سمندر کی بیکرانی اور صحرا کی بے پایانی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلخ سے کوچ کرنے اور مختلف مقامات سے گزرنے کے تجربے نے جہاں کلام رومی میں گہری معنویت پیدا کر دی ہے، وہیں مختلف اکابر سے ملنے اور تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں ایسی رنگارنگی پیدا کر دی ہے جو ابن بطوطہ کے سفرنامے سے کہیں زیادہ معنی خیز بھی ہے اور اثر انگیز بھی!

ہم ابتدا میں یہ دیکھ آئے ہیں کہ دنیا کے دیگر نامی گرامی شعراء کی حیات کے برعکس رومی کی زندگی طلاطم خیز سمندر کی مانند تھی۔ اس میں ٹھہراؤ نہ تھا، رکاوٹ نہ تھی، تعطل کا شائبہ نہ تھا۔ یہ زندگی ایک ایسے سفر کی مانند تھی جو سدا جاری رہی۔ یہ سارے تجربات، مشاہدات اور تاثرات جو کم عمری سے ہی اثاثۂ حیات بنتے چلے گئے، جب ادھیڑ عمری میں مولانا کی سخن گوئی کے دائرے میں سمانے لگے تو گویا ایک بھونچال آ گیا۔ یہ سارے حقائق مسلسل سفر حیات اور متنوع مناظر کے نتیجے میں ہی اشعار رومی میں ڈھلے ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی مانگے، تانگے کی نہیں۔ سب کی سب رومی کی اپنی متاع بے بہا ہے جسے ان کی فطری خلاقیت نے بال پر عطا کر کے دوامی بنا دیا..... اس قول کے مصداق:

Marfat.com

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا رومی کے کلام میں یہ جو دوامی رنگ پایا جاتا ہے وہ دراصل ان کے عمیق مشاہدے اور دنیاوی تجربے کا ہی رہین منت ہے۔ جیسا کہ قبل لکھا گیا، بچپن سے ادھیڑ عمری تک اور بلخ سے ترکی تک انہوں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا، اسے نہاں خانۂ دل میں محض سینت سینت کر ہی نہیں رکھا بلکہ اپنی شاعری کے فریم ورک میں اسے گاہے بہ گاہے سجاتے بھی چلے گئے ہیں۔ اس طرح ان کا کلام محض ایک مقام، ایک موسم، ایک وقت اور ایک خاص جذبے تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ اس میں آفاقیت پیدا ہوگئی ہے اور یہ ہر دور، ہر زمانے اور ہر مزاج کے قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ایسا عموماً کم ہی ہوتا ہے، لیکن مولانا جلال الدین رومی اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ انہیں ازمن الغیب اس فریضے کی ادائیگی کے لیے شمس الدین تبریزی اور ان کے مرشد بابا کمال کا ''غیر مرئی'' تعاون حاصل رہا۔

اس غیبی طاقت کا ہی نتیجہ ہے کہ رومی کسی ایک موضوع اور کسی ایک عنوان کے اسیر ہو کر نہیں رہ گئے۔ ان کے موضوعات کی کثرت اور عنوانات کا تنوع اس درجہ ہے کہ قاری خواہ کسی بھی ذوق کا حامل ہو، کسی بھی جذبے کا اسیر ہو اور کسی بھی مزاج کا آدمی ہو، کلام رومی اسے متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

ذرا غور کیجیے! جس شخص کے دادا حسین خطیبی نے شعر نہ کہا ہو، جس کے والد بہاء الدین ولد نے ایک بیت بھی موزوں نہ کیا ہو اور جس نے خود کامل چالیس سال کی عمر تک شعر گوئی کے کوچے میں قدم نہ رکھا ہو، وہ ایک دم شاعر بن جائے، یہ یقیناً ایک راز ہے جس کا ربط سراسر مبدئے فیض سے ہے۔ جب قدرت کو منظور تھا، مولانا جلال الدین کو حریر و پرنیاں کے لباس میں ملبوس کر کے مزین و منقش مسند پر بٹھائے رکھا..... اور جب انہیں شاعر بنانا مقصود ہوا تو ایک ساعت اور ایک آن میں سب کچھ بدل کر رکھ دیا اور مولانا جلال الدین شاعر رومی کے روپ میں اس طرح دنیا کے سامنے آئے کہ ان کے بعد کا ہر شاعر ان ہی کا خوشہ چیں بن گیا۔ گویا رومی نے بزم سخنوراں میں قدم رکھتے ہی اُردو کے عظیم شاعر میر انیس لکھنوی کے انداز میں یہ ضرور اعلان کیا ہوگا۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

Marfat.com

اس حقیقت میں کلام نہیں کہ مولانا جلال الدین رومؔی نے اپنے ہمہ رنگ کلام کی بدولت مضامینِ نو کے انبار لگا دیئے۔ ''دیوان شمس تبریز'' ہو یا ''مثنوئ معنوی'' وہ ہر جگہ ایک ایسے شناور کی مانند ابھرتے ہیں جو کسی محدود جھیل میں پیرا کی نہیں کرتا بلکہ قلزم بے پایاں ہی اس کی جولانیوں کا مرکز و محور ہے۔ یہ بحر ذخار جو شاعری کے روپ میں فارسی زبان و ادب کے دائرے میں سمو دیا گیا، کیا معنی، کیا مفہوم، کیا طرز ادا، کیا جذبۂ عشق، کیا رنگِ وصال، کیا داغِ فرقت ..... ہر متنوع موضوع پر محیط ہے۔ زندگی کا کون سا رخ ہے جو شاعر رومی کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو۔ ایسی کون سی حقیقت ہے جو ''دیوان'' اور ''مثنوی'' کے خالق کے احاطۂ فکر میں انگڑائی نہ لے رہی ہو۔

اگر ہم رومی کی غزلیات کے مجموعے اور چھ دفتر پر مشتمل مثنوی کا بغور جائزہ لیں تو برملا یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک دنیائے معانی ان دونوں میں متحرک نظر آتی ہے۔ چونکہ مولانائے روم تصوف کی وادی سے ہو کر شعر و سخن کے گلزار میں وارد ہوئے تھے، لہٰذا یہ اہم موضوع ان کی فکر و فہم سے مسلسل دامن گیر رہا ہے اور وہ ایسے ایسے نکات بیان کرتے چلے گئے ہیں جو انہیں کچھ تو خاندانی میراث کے طور پر حاصل ہوئے اور کچھ شمس تبریزی کی صحبت میں میسر ہوئے۔ اس بات کے اظہار میں شمہ برابر مبالغہ نہیں ہوگا کہ مولانا نے جو کچھ پڑھا تھا، جو کچھ استادوں سے سیکھا تھا اور جو کچھ دوران تدریس ان پر القا ہوتا چلا گیا تھا، وہ سارے موضوعات نہایت فنکارانہ طور پر ان کے کلام کی زینت بن گئے ہیں..... اور ان میں اضافہ روحانی تعلیم تبریز کی بدولت بہ طریق احسن ہو گیا۔

اگر ہم تجزیہ کریں تو مولانا رومی کی شاعری میں تصوف کے مندرجۂ ذیل موضوعات حسن ابلاغیات کے ساتھ در آئے ہیں:

- الٰہیات
- وحدت الوجود
- وحدت الشہود
- جبر و قدر
- سلوک و معرفت
- شریعت و طریقت

Marfat.com

- فلسفۂ حیات
- جدوجہد
- فنا وبقا
- عبادت وریاضت

یہ وہ موضوعات ہیں جن پر فارسی شعراء اگرچہ اظہار خیال کرتے رہے ہیں، مگر مولانائے روم کا اپنا ایک خاص انداز ہے اور اسی منفرد پیرائے میں وہ مذکورہ بالا موضوعات کو شعر وسخن کا لبادہ اوڑھاتے رہے ہیں۔ اس طرح وہ کوچۂ تصوف میں منفرد مقام کے حامل بن گئے ہیں۔ اس پر خود ان کی اپنی اجارہ داری ہے کہ یہ کسی کی دین نہیں!

مذکورہ موضوعات کے ساتھ ہی حسن وعشق کے مضامین نے جس طرح جلال الدین رومی کے کلام کو ہمہ رنگی عطا کی ہے اور جذبات کے شعلے کو جس انداز میں قرطاسِ سخن پر رکھ کر قارئین کے دلوں کو گرمایا ہے..... اور گرما رہے ہیں..... کیا اس کی مثال دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری میں مل سکتی ہے۔ کیا اس بساط ارضی پر کوئی ایسا شاعر گزرا ہے جس نے زندگی کے پاتال میں اتر کر پیچ وخمِ حیات کا تجزیہ کیا ہو۔ جس کے کلام بلاغت نظام نے ہزاروں ہزار افراد کے دلوں میں ہلچل مچادی ہو۔ جس کی مثنوی کی شرح وسیع وبسیط انداز میں اس طرح لکھی گئی ہو کہ وہ کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہو۔ اور جس کے ترجمے دنیا کی متعدد زبانوں میں ایک ''عبادت'' سمجھ کر کیے گئے ہوں۔ اور کیا کوئی ایسا عالمی شہرت کا حامل شاعر بھی گزرا ہے جس کے اشعار پڑھنے کا ایک خاص انداز وضع کیا گیا ہو[1]۔ جواب یقیناً نفی میں ہوگا..... اوروں کے لیے یہی ''نفی'' مولانا جلال الدین رومی کے لیے ''اثباتِ عظمت'' ہے اور اس

---

1 مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواروی سلسلۂ چشتیہ کے رکن رکین اور حاجی شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مسلک سے وابستہ تھے۔ ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کے پُر کیف وپُر اثر خطبوں اور وعظوں سے معمور تھا۔ ندوۃ العلماء اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مولانا کے وعظ کے بغیر بے مزہ اور پھیکے رہتے تھے۔ نیز، اُردو زبان میں سیرۃ النبیؐ کو زبانی بیان کرنے کی بنیاد سب سے پہلے شاہ صاحب ہی نے ڈالی۔ شاہ صاحب کی ایک اہم صفت مثنوی مولانا روم کی مدہوش کر دینے والی قرأت تھی۔ ان کے زمانے میں مثنویٔ معنوی کا ان سے بہتر پڑھنے والا کوئی موجود نہیں تھا۔ آپ کے انوکھے طرز خطابت اور مثنویٔ رومی پڑھنے کے مسحور کن انداز نے شاہ صاحب کو عوام میں طوطیٔ ہند کے خطاب سے مشہور کر دیا تھا۔
شاہ سلیمانؒ کے چھوٹے صاحبزادے مولانا شاہ جعفر پھلواروی نے بھی اپنے والد کے طرز پر مثنویٔ رومی پڑھنے میں خاصی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اہل لاہور خصوصاً اور اہل پاکستان عموماً آپ کے انداز دل سوزی ودل دوزی سے متاثر تھے۔

عظمتِ شعری کا ثبوت درج ذیل اشعار کے مطالعہ سے ہمیں مل جائے گا ۔

معشوقہ بہ سامان شد، تا باد چنین بادا
کفرش ہمہ ایمان شد، تاباد چنین بادا

(معشوقہ اب مائل ہوگئی ہے اور کفر اب ایمان کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ کاش یہ صورت حال اسی طرح قائم رہے۔)

بکشاد نشانِ خود بربستِ میانِ خود
پر کرد کمانِ خود تا راہ زند مارا

(میرے رہزن نے اپنا علَم لہرا کر اور اپنی کمان جوڑ کر مجھے اپنے نشانے پر لے لیا ہے۔)

ای یارما دلدار ما ای عالم اسرار ما
ای یوسف دیدار ما ای رونق با زار ما

(اے میرے یار تو میرا دلدار ہے، تو عالم اسرار ہے تو یوسف دیدار ہے اور تو رونق بازار ہے۔)

ما خستگانیم و توی صد مرہم بیمار ما
مابس خرابیم و توی ھم از کرم معمار ما

(ہم تھک کر چور ہو چکے ہیں۔ تو ہی ہماری بیماری کا مرہم ہے۔ ہم ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں اور تو ہمارا معمار ہے۔)

ای شاد کہ ماہستم اندر غمِ تو جانا
ہم محرمِ عشقِ تو ہم محرمِ تو جانا

(مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ میں تیرے غم میں گرفتار ہوں۔ میں ایک طرف تیرے عشق کا محرم بھی ہوں اور خود تیرا بھی محرم ہوں۔)

ای بگرفتہ ازوفا، گوشہ کران، چرا چرا
برمنِ خستہ کردہ ای، روی گران، چرا چرا

(اے باوفا گوشہ نشین مجھ سے کیوں نہاں ہے اور میرے خستہ دل کے لیے تو روئے گراں

Marfat.com

کیوں بنا ہوا ہے۔)

یہ عجیب ستم طریفی ہے کہ ثنا خوانِ رومی نے ''دیوان'' کو یکلخت فراموش کر دیا اور سب کے سب ''مثنوی'' کی جانب متوجہ ہو گئے..... یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ''دیوان شمس تبریز'' کو رومی و تبریز کی ملکیت کے جھگڑے ہی میں آلودہ کر دیا گیا اور اس کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے جگر کو پاش پاش کرنے والے کلام کو کاہ برابر اہمیت نہ دی گئی ورنہ کوئی امر مانع نہ تھا کہ اس کے تراجم بھی کیے جاتے، تشریح بھی لکھی جاتی اور تفسیر بھی بیان کی جاتی! کیا صنفِ غزل اس اعزاز کی حقدار نہیں!

زیرِ نظر باب چونکہ رومی کی ہمہ رنگ شاعری کے تجزیے کے لیے مخصوص ہے، لہٰذا مثنویٔ روم کا بھی جائزہ لینا ضروری تھا۔ مگر میں اس سے پہلو تہی اس لئے کر رہا ہوں کہ اگلا باب اسی موضوع پر مشتمل ہے اور تکرارِ بیان مناسب نہیں لگتا۔ علامہ جمیل مظہری کے اس مصرع پر بابِ ہذا کو ختم کر رہا ہوں ع

حکایتیں ہیں اور بھی ورق الٹ کتاب کا

Marfat.com

مثنویٔ معنوی.....ایک جائزہ

مجھے یہ کہنے دیجیے کہ ''دیوانِ رومی'' کی تخلیق جہاں شمس الدین تبریزی کی ذاتِ اقدس کی رہین منت ہے، وہاں ''مثنویٔ مولانائے روم'' فی الحقیقت جلال الدین کے مرید وعقیدت مند حسام الدین چلپی کی مہمیز زنی کا ہی ثمرہ ہے۔ انہیں یہ حقیقت معلوم تھی کہ جب مولانا رومی کے والد شیخ بہاء الدین ولد بلخ سے ہجرت کر کے دیارِ مغرب کی جانب روانہ ہوئے تو کچھ عرصہ نیشاپور میں بھی قیام فرمایا تھا۔ وہیں وقت کی جلیل القدر ہستی اور معروف مثنوی نگار شیخ فریدالدین عطارؒ سے ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف نے نہ صرف کمسن رومی کو دعاء دی تھی بلکہ اپنی کتاب ''اسرارنامہ'' بھی نذر کی تھی۔

حسام الدین چلپی کو یہ بھی معلوم تھا کہ مولانا رومی خواجہ عطارؒ کے بے حد گرویدہ تھے اور ان کا تذکرہ بھی نہایت عقیدت بھرے لہجے میں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک شعر بھی اس نوعیت کا کہا تھا ؎

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

چنانچہ لائق مرید ومعتقد حسام الدین چلپی نے مولانا رومی سے درخواست کی کہ شیخ فریدالدین عطار کی کتاب ''منطق الطیر'' کے طرز وانداز پر ایک مثنوی لکھی جائے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سنائی کا

Marfat.com

نام بھی لیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے چلپی کی یہ استدعا سن کر برجستہ جو جواب دیا، اس سے علوم ظاہری کے مرد میداں یقیناً حیران و ششدر ہو جائیں گے:

''عزیز گرامی! خود مجھے بھی رات یہی خیال آیا اور اسی وقت یہ چند شعر موزوں ہوئے۔''

مولانائے روم یہ کہہ کر مسکرائے اور اپنی دستار کے اندر سے کاغذ نکالا جس پر مثنوی کے ابتدائی اٹھارہ اشعار لکھے ہوئے موجود تھے۔ حسام الدین چلپی نے بہ اشتیاق ان اشعار پر نظر ڈالی اور معنی و مفہوم کی تہہ تک پہنچ گئے۔ پھر مزید لکھنے کی گزارش کی اور اس کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ پھر یہ صورت رہی کہ کامل بارہ سال تک مثنوی کے چھ دفتر اپنے مرید اور شاگرد چلپی کو املا کراتے رہے[1]۔ اشعار کی مجموعی تعداد 25700 ہے۔

اس حقیقت میں کلام نہیں کہ مولانائے روم تلمیذ الرحمٰن تھے۔ ان پر شعر ہر آن وارد ہوتے۔ بعض اوقات رات کو یہ سلسلہ شروع ہوتا اور صبح تک جاری و ساری رہتا تھا۔ بعد میں کاتبِ مثنوی حسام الدین چلپی لکھے ہوئے اشعار پڑھ کر مولانا کو سناتے۔ اس دوران کوئی سقم نظر آتا یا وزن و بحر کی خامی محسوس ہوتی تو مولویٔ معنوی اس کی تصحیح فرما دیتے تھے۔ اس طرح رومی کی فکری کاوش اور چلپی کی املا نویسی کی بدولت جو شاہکار مثنوی کی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا، اس کی بابت خود صاحبِ تخلیق یہ جملہ رقم کر گئے تھے:

''دوستوں کے لیے یہ نور ہے اور اخلاف کے لیے خزانہ!''

بلاریب، مثنویٔ مولانائے روم ہر زمانے میں نور کا ہالا بنی رہی ہے اور علم و حکمت کا خزانہ ثابت ہوئی ہے۔ ان دو عناصر کی وضاحت سے قبل ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر تاریخ مثنوی میں ''مثنویٔ معنوی'' کو سب مثنویوں میں منفرد حیثیت کیوں کر حاصل ہوئی اور اس کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی میں دیگر چراغوں کی لَو مدھم کیوں ہو گئی۔ بایں ہمہ، یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس صنف شاعری میں ایسی کون سی صفت تھی جس نے مولانا جلال الدین کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی، اور اس طرح کر لی کہ بس وہ مثنوی ہی کے ہو کر رہ گئے۔

---

1 درمیان میں حسام الدین چلپی کی اہلیہ کی وفات کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا تھا۔ وہ بیوی کی موت پر غم زدہ تھے اور مولانا رومی بھی چپ رہے۔

Marfat.com

غزل گوئی اور قصیدہ نگاری کی طرح مثنوی نویسی بھی فارسی ادب کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔اس کی خارجی ہیئت ایسی ہے کہ وسیع و بسیط موضوع کو نہایت سہولت اور تسلسل کے ساتھ حد درجہ رواں اور مترنم بحر میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی مثنوی میں ایک بحر منتخب کر کے مطلوبہ اشعار رقم کر دیئے جاتے ہیں۔ اشعار کی تعداد مقرر نہیں اور صرف ایک شعر کو ہم قافیہ و ہم ردیف ہونا ہوتا ہے۔

چونکہ یہ صنف سخن قافیہ، ردیف اور دیگر پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں، لہٰذا مفصل اور وسیع نوعیت کے مضامین کے لیے یہ حد درجہ موزوں اور مناسب قرار دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے زبانِ فارسی نے عشقیہ داستان، عرفانی موضوع اور اخلاقی مضمون کی وسعت و جامعیت کا لحاظ کرتے ہوئے اسی صنف کا انتخاب کیا ہے۔اور یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کامیاب و کامران رہے ہیں۔ بے موقع نہ ہوگا کہ اگر ہم یہاں مثنوی کی اہمیت و وقعت کے حوالے سے علامہ شبلی نعمانی کی رائے پیش کر دیں:

> ''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع شاعری کی نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔شاعری کی جس قدر انواع ہیں، سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذباتِ انسانی، مناظر قدرت، واقعہ نگاری، تخیل..... ان تمام چیزوں کے لیے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ میں نہیں آ سکتا۔ مثنوی میں اکثر کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔اس بنا پر زندگی اور معاشرے کے جس قدر پہلو ہیں، سب اس میں آ جاتے ہیں۔ عشق و محبت، رنج و مسرت، غیظ و غضب، کینہ و انتقام، غرض جس قدر انسانی جذبات ہیں، سب کے سماں دکھانے کا موقع مل سکتا ہے۔ اخلاق، فلسفہ، تصوف کے مسائل نہایت تفصیل کے ساتھ ادا کیے جا سکتے ہیں۔''

مثنوی کی مذکورہ ہیئتی خصوصیات کی بنا پر فارسی زبان و ادب کے ممتاز شعراء نے اپنے وسیع و عریض اور بسیط و بے شمار خیالات و افکار کے اظہار کے لیے اسے اختیار کیا اور ایک دنیا کو محوِ حیرت کر دیا۔ان میں ابوشکور بلخی ہیں، مسعودی رازی ہیں، اور رودکی جیسی ممتاز شخصیت ہے جس نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ''کلیہ و دمنہ'' کو مثنوی کی ہیئت میں منظوم کیا۔ بایں ہمہ، قدیم ترین فارسی مثنوی شاہنامۂ دقیقی طوسی ہے۔ یہ وہ مثنوی ہے جس کے ایک ہزار اشعار کو فردوسی جیسے عظیم شاعر نے اپنے شاہنامہ میں نقل کر کے اسے معدوم ہو جانے سے بچا لیا۔ پھر، عہد غزنوی میں معرکتہ الآرا نوعیت کی

مثنویاں لکھی گئیں۔

مذکورہ دور میں فارسی کے ممتاز سخن گو عنصری نے بھی کئی مثنویاں تحریر کیں۔ مثلاً وامق وعذرا، سرخ بت وغیرہ! یہی وہ غزنوی دور ہے جس میں طرۂ امتیاز کی حامل مثنوی یعنی ''شاہنامۂ فردوسی'' لکھی گئی۔ اگرچہ بعد کے متعدد فارسی گو شعراء اس مثنوی کے تتبع میں اپنی اپنی مثنویاں رقم کرتے رہے، مگر جو شہرت و مقبولیت ''شاہنامۂ فردوسی'' کو حاصل تھی، اس کی گرد کو اس دور کی کوئی بھی مثنوی پہنچ نہ سکی۔ آج بھی اس کا جواب نہیں!

ازاں بعد، اس صنف سخن کو وسعت و منزلت عطا کرنے والے فارسی شعراء میں متعدد نام سامنے آتے ہیں، مثلاً اسدطوسی، سنائی، نظامی گنجوی اور شیخ فریدالدین عطارؒ! ان سب کی فکری کاوشیں اور ادبی محاسن فارسی مثنوی گوئی کو عروج واستحکام عطا کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہوئے ہیں۔ ان تمام مثنوی گویوں نے مثنوی کے مروجہ خاکے میں جو رنگ بھرا ہے وہ تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ ان مثنویوں میں موضوع کی وسعت ہے، خیال کی گہرائی ہے، فکر ودانش کی پہنائی ہے، جذبات کی بوقلمونی ہے، عشق کی آنچ ہے، حُسن کی دلفریبی ہے، رزم کی جھنکار ہے، عاشق ومعشوق کی داستانِ فراق ووصال ہے اور تصوف کے مضامین ہیں۔ ان تمام عناصر نے فارسی زبان وادب کے متذکرہ بالا شاعروں کی مثنویوں کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔

بے موقع نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایک لمحہ رُک کر ''ادب نامہ فارسی'' کے مصنف مقبول بیگ بدخشانی کی مندرجۂ ذیل رائے کا جائزہ لے لیں:

> ''ایران کے متقدمین میں اقلیم سخن کے بڑے بڑے تاجدار گزرے ہیں۔ لیکن کسی کی قوت سخن سرائی میں نظامی کی طرح ہمہ گیری نہ تھی۔ فردوسی کا نام رزمیہ مثنوی کی بدولت زندہ ہے۔ خیام نے رباعی کے ذریعے فلسفہ وحکمت کی ترجمانی کی۔ انوری و خاقانی فلسفے کے استاد تھے۔ سعدی غزل اور اخلاقی شاعری کے بادشاہ ہیں۔ حافظ غزل سرائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عطار نے صوفیانہ مطالب مؤثر انداز میں بیان کئے ہیں۔''

یہ حقائق ادبی وتاریخی لحاظ سے اپنی جگہ درست ہیں اور قابل اعتماد بھی! لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا جلال الدین رومی اپنا ایک مستقل رنگ اور اپنی ایک مستقل آواز رکھتے ہیں۔ انہوں نے

Marfat.com

صوفیانہ شاعری میں اپنا بلند و بالا اور دلکش قصر الگ ہی تعمیر کیا ہے اور اس پر اپنا دائمی پرچم لہرا دیا ہے۔ اس کا نظارہ محض قونیہ کی حدود تک محدود نہیں، بلکہ تمام اقصائے عالم میں اس کی جلوہ ریزیاں دل و نگاہ کو مسحور کیے دے رہی ہیں۔

''مثنویٔ معنوی'' مولانا کا ایک ایسا شاہکار ہے جس نے شہرت و مقبولیت میں دیگر تمام تخلیقات فارسی کے مقابلے میں ابدیت حاصل کر لی ہے۔ اس شاہکار کی عظمت و رفعت کے قائل اہلِ زبانِ فارس ہی نہیں، مغربی علوم کے ماہرین بھی پیش پیش رہے ہیں اور ایسے کہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شاہکارِ رومی کو سمجھنے، اس کا ترجمہ کرنے اور اس کی تشریح بیان کرنے میں گزار دی۔ ان میں نمایاں نام حسب ذیل ہیں:

- آر۔اے۔ نکلسن
- سر جیمیس ریڈ ہاؤس
- ای۔ایچ۔ وھنفیلڈ
- ای۔جی۔ براؤن
- ڈاکٹر این میری شیمل
- ولیم سی، چٹک
- ہیڈ لینڈ ڈیوس
- ای۔ای۔۔ پامر

مذکورہ بالا مغربی مصنفین کا مطالعۂ رومی، تحقیقِ رومی اور ترجمہ و تشریحِ رومی کا جذبۂ بے پایاں اس امر کا غماز ہے کہ یہ ادبی شخصیات ''مثنویٔ معنوی'' کے نہ صرف مطالعہ میں غرق رہیں بلکہ مولانائے روم کے ارفع و اعلیٰ افکار و نظریات سے متاثر بھی ہوتی رہیں۔ یہ حقیقت ثابتہ بلا شک و شبہ اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ دنیائے مثنوی میں مولانائے روم نہ صرف منفرد مقام کے حامل رہے ہیں بلکہ چھ جلدوں پر مشتمل اس مجموعے نے فکر و دانش کے وہ وہ موتی بکھیرے ہیں اور ایسے ایسے جواہر پارے اچھالے ہیں کہ ان کی تابانی نے ہر گوشۂ دل کو اجال کر رکھ دیا ہے۔ یہ بہت بڑا اعزازِ رومی ہے جو بلا ریب ان ہی کا مقدر بنا ہے اور اس عطیۂ خداوندی میں کوئی اور نہ ان کا شریک ہے اور نہ ان کے مدمقابل!

اس حقیقت میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مولانا جلال الدین رومی کی ''مثنویٔ معنوی'' فارسی ادب تو کیا، ادبیات عالم میں ایک ایسے شاہکار کا مقام ومرتبہ حاصل کرگئی ہے جو عرفانی بھی ہے اور لافانی بھی! اور اس کی تمام تر وجہ ان کا عارفانہ انداز بیان اور صوفیانہ طرزِ کلام ہے۔ مشرق ومغرب کے تمام ناقدوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ مولانائے روم دنیا کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں اور ہم مثنوی کو ان کے افکار عالیہ کا گراں بہا مرقع اور بلند پایہ اشعار کا دلکش ودل پذیر مجموعہ قرار دے سکتے ہیں۔

یوں تو تصوف کے موضوع پر دنیا کے مختلف شعراء نے خامہ فرسائی کی ہے اور ایک فقیرِ بے ریا کے جذبۂ صادق کی ترجمانی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ اس قبیل کے سخنوروں کی فکری کاوش قابل تعریف ہے، لیکن یہ اعزاز صرف مولانا جلال الدین رومی کو ہی حاصل ہے کہ ان کی ستائیس ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل مثنوی فارسی زبان وادب میں تصوف کا ایک مکمل ترین، جامع اور مبسوط دیوان ہے جو اسی گلدستے کی مانند ہے جسے، بقول کرا خاتون، چھ رجال الغیب نے نصف شب کو دیوار شق کر کے اندر آجانے کے بعد مولانا روم کو مرحمت کیا تھا اور جو مولانائے محترم کی وفات کے سالہا سال بعد بھی اسی طرح تروتازہ، معطر اور پُر بہار تھا۔ اور یہ ''مثنویٔ معنوی'' بھی اسی آفاقی گلدستے کی مانند صدیاں گزر جانے کے بعد بھی رنگ ونور وبوئے گلشن کی ابدی حیثیت اختیار کرگئی ہے اور اس پر یہ فقرہ ہر طرح صادق آتا ہے:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دوامی حیثیت اختیار کرنے والی ''مثنویٔ معنوی'' متنوع موضوعات اور فکر ودانش کا جہاں ایک مرکز ومنبع ہے، وہاں اس کی انفرادیت بھی کلاسیکی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ آپ کوئی کتاب، کوئی دیوان، کوئی مجموعہ اٹھا کر دیکھیں، اس کا آغاز مروجہ طریقے سے ہوا کرتا ہے۔ کہیں حمد ہوتی ہے، کہیں نعت مندرج ہوتی ہے اور کہیں منقبت رقم کی جاتی ہے۔ یا پھر ''تمہید'' سے آغاز ہوا کرتا ہے۔ مگر مولانائے روم کے انفرادیت پسند مزاج نے اس مروجہ انداز اور رسمی طریقۂ کار سے اجتناب برتا اور وہ براہ راست آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ عرفانی رنگ وآہنگ قاری کو دم بخود کردیتا ہے۔

Marfat.com

بشنو از نَے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

(سُنو کہ بانسری کیا حکایت بیان کرتی ہے اور جدائی کے لمحات کی کس طرح شکایت کرتی ہے۔ وہ یہ کہہ رہی ہے کہ جب سے مجھے بانس کے جنگل سے کاٹ دیا گیا ہے، میرے نالہ وفریاد سن کر سب ہی مرد وزن آہ وفغاں کرنے لگے ہیں۔ میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو فراق کے درد سے پارہ پارہ ہو چکا ہوتا کہ میں اسے سناؤں کہ عشق کا کرب والم کیا ہوتا ہے اور فراق یار کے لمحات کس درجہ سوہان روح ہوا کرتے ہیں۔)

مولانائے روم کی ضخیم وجلیل مثنوی کا سرنامہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ دنیا کے تمام ادبی شاہکاروں میں اس انداز کا آغاز ہمیں شاذ ونادر ہی نظر آئے گا جو ایک ایسے موضوع پر مبنی ہے جو فی الحقیقت انسان کی اپنی کہانی ہے۔ وہ انسان جس کا پتلا خالقِ ارض وسمانے خود اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور اس ہیولے میں روح پھونکی۔ جس کا مستقر تھا فردوسِ بریں! جس کے تصرف میں بہشتی نعمتیں تھیں! جسے قربِ خداوندی حاصل تھا۔ مگر ایک لغزش پا کے نتیجے میں زمین کے پاتال میں پھینک دیا گیا۔ جہاں وہ پے بہ پے حوادث کا شکار ہوا، رنج ومحن سے دوچار ہوا، فراقِ محبوبِ ازلی میں اس کا سینہ فگار ہو گیا..... یہ سارے عناصر کوئی تخیلاتی کہانی نہیں، زندگی کی حقیقت ہے..... ایک ایسی حقیقت جو فسردہ دلی اور محزوں طبعی سے عبارت ہے۔ یہ ابن آدم کا مقدر ہے اور اس سے پہلو تہی برتنا گویا انسانی نفسیات کی نفی کرنا ہے۔

مولانائے روم سے بڑھ کر کون انسانی نفسیات کا رازداں ہو سکتا ہے، جن کی ساری زندگی حادثات کے پیچ وخم سے وابستہ رہی۔ ایک عظیم مدرسے کے مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے وہ ہزاروں ہزار طلبہ کے مزاج آشنا تھے۔ جنہوں نے حیاتِ دوروزہ کے ہر ہر رُخ کو بنظرِ غائر دیکھا تھا۔ جو سلطنت

Marfat.com

خوارزم شاہ کے مفتیٔ اعظم تھے اور عوام الناس کے پیچیدہ مسائل سے ہر آن آشنا ہوا کرتے تھے۔ جنہوں نے وقت کی طنابوں کو اپنی مٹھیوں میں سمیٹ لیا تھا۔ ایسا ہی شخص بانسری کے درد بھرے نغمے کا ذکر کر کے عالمی ادب میں اپنی انفرادیت کا علَم بلند کر سکتا ہے۔ اور جلال الدین بلخی ثم رومی نے ایسا کر دکھایا اور بہ انداز دگر!

آپ اسی آغاز سے اندازہ لگا لیں کہ چھ جلدوں پر مشتمل اس مثنوی میں کیا کچھ نہ ہو گا.....

حیات و کائنات روز ازل سے انسانی فکر کا محور رہی ہے۔ مولانا رومی نے اس اہم موضوع کے بارے میں فلسفیانہ و حکیمانہ نکات بیان کئے ہیں۔ مختلف صوفی بزرگوں اور شاعروں کا تذکرہ ان کے فکر و خیال کے حوالے سے کیا ہے اور اپنی وسیع النظری کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ قرآن مجید کے دقائق و رموز شگفتہ و شیریں زبان میں درج کئے ہیں۔ روزمرہ زندگی کے واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے جسے ہم نے کبھی کاہ برابر اہمیت نہ دی، لیکن مولانا نے مثنوی کا حصہ بنا کر اس کی اہمیت اجاگر کر دی۔

مولانائے روم کی نگاہ عمیق تھی۔ انہوں نے انسانی زندگی کے خفتہ گوشوں کو دائرۂ نور میں لا کر اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا کہ وہ دانا بھی تھے اور بینا بھی! ان کا فکر و شعور بیکراں سمندر کی مانند تھا جس کی موجیں ہمیشہ ارتعاش پذیر رہتی ہیں اور تاحدِ نظر اس بحرِ بے پایاں کا کنارہ نظر نہیں آتا۔ ایسی جولانی، ایسی بیکرانی، ایسی وسعت اور ایسی پہنائی ہمیں دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ ہم بلاخوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی عطیۂ خداوندی تھا جو شمس تبریز کی جدائی میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا اور اپنی جلوہ گری سے ایک عالم کو ہنوز دم بخود کئے ہوئے ہے۔

بعض سخنوروں کی سخن سنجی محض ان کے اپنے جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دلی کیفیات اشعار کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ چونکہ قارئین کے اپنے جذبات و محسوسات کے ڈانڈے زیر بحث شاعر کی قلبی واردات سے ملتے ہیں، لہٰذا وہ متاثر بھی ہوتے ہیں اور واہ، واہ کا کلمۂ تحسین بھی ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ اس خصوصیت سے ہم شمہ برابر انکاری نہیں۔ مگر آفاقی رنگ، دائمی نشان اور ابدی تاثر کچھ اور ہی چیز ہے جو ہر کے بس کا روگ نہیں!

مولانائے روم دنیا کے عظیم شعراء کی صف اولیں سے بھی بلند ایک مخصوص مقام کے حامل سخنور تھے۔ وہ اپنا کلام خود کہتے نہ تھے، ان سے غیبی طاقت کہلواتی تھی۔ چنانچہ ایسے شعری افکار کا دائرہ

Marfat.com

مخصوص ومحدود نہ تھا، وقتی ولمحاتی نہ تھا، خاص الخاص سامع وقاری کے لیے نہ تھا.....اس مثنوی کے مخاطب پورا عالم اوراس میں بسنے والے انسان تھے، ہر زمانے کے لوگ تھے، ہر دور کے باشندے تھے۔ان سبھوں کے لیے یہ اشعار پیش کیے گئے تھے اور کچھ اس طرح ؎

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے مرا فرمایا ہوا

(میر)

اپنے مستند افکار ونظریات کے ذریعے پورے عالم پر چھا جانے والے مولانا جلال الدین رومی کی ''مثنویٔ معنوی'' کا اگر ہم بنظر غائر جائزہ لیں تو ایسا محسوس کریں گے کہ اس کی حیثیت ایک انسائیکلو پیڈیا کی ہے۔زندگی خود ایک اہم موضوع ہے اوراس سے وابستہ حقائق متعدد بھی ہیں، متنوع بھی! لامحدود بھی ہیں اور لامتناہی بھی!.....مولانائے روم نے ان تمام عوامل کا بنظر غائر جائزہ لے کر انہیں اس طرح سُبک وشیریں انداز میں پیش کیا ہے کہ ''دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست'' کے مصداق ہر قاری ان اشعارِ مثنوی کا اسیر ہو جاتا ہے۔

مولانا رومی بنیادی طور پر ایک معلم تھے۔قونیہ کے سب سے عظیم مدرسے کے مہتمم تھے۔ان کی سرپرستی میں ہزاروں طلبہ حصول علم وادب میں مشغول رہتے تھے۔جب وہ اپنے مکان یا مدرسے سے باہر جاتے تھے تو طالب علموں کا جم غفیر ان کی سواری کے جلو میں پاپیادہ رواں دواں رہتا تھا۔اس دوران بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔مولانا اپنے طلبہ کو حکمت کی باتیں بتاتے رہتے۔گویا نوعمر افراد کی تہذیب وتعلیم سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم مثنوی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اس تدریسی دور کو بھولے نہیں ہیں اور اِس مجذوبانہ وعارفانہ طرز زندگی میں اس ہدایت و تعلیم کو سخن پردازی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔اس قلبی ماہیئت کی تبدیلی کے دور میں جب وہ مثنوی کے ذریعے سامع وقاری سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کے پیش نظر عالم بھی ہیں، عارف بھی! متبدی بھی ہیں اور عوام الناس بھی! طلبہ بھی ہیں اور نوعمر افراد بھی! وہ ان سبھوں سے ایک مشفق استاد کی طرح ہمکلام

ہوتے ہیں اور ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو ان سبھوں کی سمجھ میں آ سکے۔

اگرچہ مولانا رومی سے پیشتر تمثیلی انداز و طریقۂ کار کا رواج تھا۔ اکثر مثنوی نگاروں نے جانوروں اور پرندوں کی حکایات بیان کی ہیں اور ان سے دلچسپ انداز میں نتائج اخذ کیے ہیں۔ لیکن ہمارے ممدوح نے اپنے فلسفیانہ شعور اور شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت اس انداز تمثیل نگاری کو مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا۔ اس طرح ان کے اشعار دیرپا اثرات کے حامل بن جاتے ہیں اور اسرار کائنات اور ان سے انسانی روابط کو بہ خوبی اجاگر کرتے ہیں۔ مولانا رومی نے تمثیل نگاری کے ذریعے انسانوں کی تعلیم و تہذیب کا جو انداز اپنایا ہے، اس نے اِن کو دنیائے ادب میں ابدیت عطا کر دی ہے۔

مولانائے روم کی زیر بحث مثنوی کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ متعدد ایسے مسائل پر انہوں نے گفتگو کی ہے جن کے متعلق مذہبی، اعتقادی، جذباتی اور عقلی لحاظ سے خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک حکیمِ حاذق اور مصلحِ اعظم کی حیثیت سے ان پیچیدہ اور اختلافی امور کو مناظرے کی صورت میں، دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ زیر بحث مسائل کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو منطقی انداز میں پیش کر کے اپنی محققانہ رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں اور اپنا حتمی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔

یہاں وہ ایک عظیم مفتی کا روپ دھارے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک ایسا مفتی جس کی نظر تمام مباحث پر ہے۔ جو مسئلے کے پیچ و خم سے واقف ہے۔ جس کی نگاہ طبیعات و مابعد الطبیعات پر پوری طرح جمی ہوئی ہے۔ جو تعصب، بغض، حسد، فرقہ واریت سے پرے، ایک ایسا فتویٰ صادر کرتا ہے جو ہر فرقے، ہر نظریے کے حامل شخص اور مختلف سوچ رکھنے والے بندے کے لیے قابل قبول بن جاتا ہے۔ وہ دراصل دور از کار اور لایعنی باتوں میں پڑے بغیر مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ جو تم پیزار، لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کو انسانیت کے لیے سمِ قاتل سمجھتے ہیں۔

مولانا نے مثنویٔ معنوی میں حضرت موسیٰؑ اور ایک چرواہے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ آخر الذکر کسی جنگل میں بیٹھا اللہ تعالیٰ کو ایک گوشت پوست کا پیکر سمجھ کر اس سے اظہار عشق و محبت کر رہا تھا اور کچھ اس طرح:

''اگر تو میرے پاس ہوتا تو میں تیری کنگھی چوٹی کرتا، تجھے مسّی لگاتا، غازہ ملتا، لباس تبدیل کرتا، وغیرہ وغیرہ!''

حضرت موسیٰؑ نے یہ کلمات سنے تو بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ ''تو خدا کی شان میں کیا کفر بک رہا ہے۔'' وہ چرواہا گھبرا اٹھا، دہل گیا اور مارے ندامت کے سر جھکا لیا۔ اسے اس امر کا شدید احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے محبوب (باریٔ تعالیٰ) کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..... اور اُدھر اللہ تعالیٰ کو چرواہے کا یہ انداز تخاطب بے حد اچھا لگ رہا تھا۔

جب چرواہے کو چپ لگ گئی، وہ دہشت زدہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر جس طرح اپنی برہمی کا اظہار کیا اسے مولانا رومی نے نہایت مؤثر انداز میں پیش کر دیا ہے۔

تُو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

مولانائے روم اللہ تعالیٰ کے اس تنبیہی پیغام پر ہمیشہ کاربند رہے۔ وہ مسلمانوں کے اختلافی مسائل کو ختم کر کے ان سبھوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے آرزومند تھے۔ اور ''مثنویٔ معنوی'' اس نظریۂ رومی کی بھرپور تفصیل ہے۔ موصوف کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنی مثنوی کے ذریعے تمام بندگانِ خدا کو ایک مرکز پر لائیں جہاں خُلق و محبت کی فضا ہو، اخوت اور ملاپ کا سماں ہو، رنگِ وحدت و یکسانیت ہو اور تمام بنی نوع انسان خاندانِ آدم علیہ السلام کی اکائی بن کر رہیں۔

میرا یقین کامل ہے کہ دنیا کے کسی بھی شاعر نے اس انداز سے ابن آدم کو متحد کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ دیگر شعراء اپنے ملک، اپنے ماحول، اپنی تہذیب، اپنے نظریے اور خود اپنی ''انا'' کے زیر اثر بنی نوع آدم کو درس دیتے رہے ہیں۔ ان سبھوں کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن یہاں یہ کہے بغیر رہا نہیں جاتا کہ مولانا جلال الدین رومی نے اپنے آپ کو ذات پات، ماحول، تہذیب و ثقافت کے خول میں بند نہیں کیا تھا۔ ان کی نگاہ میں وسعت تھی۔ ان کی سوچ آفاقی تھی۔ ان کی فکر کا کینوس لامحدود تھا۔ وہ کسی خطے، کسی مخصوص مقام، کسی خاص دیار، کسی ملک و ملت کے شاعر نہ تھے، بلکہ پوری کائنات کے سخنور تھے۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ انہیں مبدۂ فیض سے سخن سنجی کا ملکہ راتوں رات ودیعت ہوا تھا، اور ایسے وقت میں جب وہ نصف عمر گزار چکے تھے۔ گویا مولانا روم ''اوپر والے'' کا ایک عطیہ تھے، ساری دنیا اور اس میں رہنے والوں کے لئے! ایسا شاعر

Marfat.com

آفاقی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

آپ غور کریں کہ مبدئے فیض نے نہ صرف اپنے ''تلمیذ الرحمٰن'' سے مثنویٔ معنوی لکھوائی بلکہ اس کے بین الاقوامی سطح پر ترجمے کا بندوبست بھی کر دیا۔ دنیا کی تمام تر زبانوں میں ترجمہ ہو کر اس مثنوی نے اصلاحِ انسانیت کے لیے جو شمع روشن کی ہے، اس کی روشنی نے رب العزت کی ایک وسیع خلقت کو بھٹکنے سے بچایا ہے اور زندگی کی صحیح سمت میں رہنمائی کی ہے۔ کہیں صفات باریٔ تعالیٰ کو اس طرح پُر اثر اور بامعنی انداز میں بیان کیا ہے کہ ذات الٰہی کے ضمن میں پائے جانے والے تمام نزاعی مسائل کا ازالہ ہو گیا اور ہر کہہ و مہہ ''مثنوی'' کی مدد سے یہ باور کرنے پر دل و جان سے آمادہ ہو گیا کہ

ایں جلالت در دلالت صادق است
جملہ ادراکات پس او سابق است

(خدا کی عظمت و شان اس کے وجود کی سچی دلیل ہے۔ تمام ادراک و شعور پسِ پشت رہ جاتے ہیں۔)

مولانائے روم نے اپنے پُر اثر کلام میں حکمت و دانش اور علمِ کلام کے نہایت دقیع اور پیچیدہ مسائل نہایت دلآویز اور شاعرانہ لب و لہجے میں اس طرح بیان کیے ہیں کہ قاری کے ذہن میں ہر گتھی سلجھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس کے سارے شکوک و شبہات کالعدم ہونے لگتے ہیں۔ وہ فکر و شعور کی جن بھول بھلیوں کا شکار ہو کر غلط فہمیوں کے لق و دق ریگ زار میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا، ان سے مطالعۂ مثنوی کے بعد اسے نجات مل جاتی ہے۔ گویا یہ مثنویٔ معنوی ایک کرشمہ ہے، ایک معجزہ ہے، اور ایسی چیز انسان کی اپنی کہی ہوئی نہیں ہوتی، بلکہ کہلوائی ہوئی ہوتی ہے..... یہی فرق ہے مولانا جلال الدین رومی کے کلام اور دنیا کے عظیم شعراء کے کلام میں! ایک اپنی انسانی فکر کی مدد سے شعر کہتا ہے اور ایک مبدئے فیض سے القا شدہ اشعار حسام الدین چلپی کو املا کراتا ہے۔ گویا مولانائے روم اپنے ذہن کے کینوس پر عالمِ بالا سے منعکس ہونے والے اشعار کو صاف اور صریح طور پر دیکھ رہے تھے، اور پھر چلپی کو بتاتے جاتے تھے۔ اس طرح ''مثنویٔ معنوی'' منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی اور آج ساڑھے سات سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی بہ حسن کمال جلوہ گر ہے۔

سطور بالا میں راقم نے جو یہ بات لکھی ہے کہ مولانا روم ''عالم بالا سے منعکس ہونے والے اشعار کو صاف اور صریح دیکھ رہے تھے'' وہ دراصل ایک عالم دین، صوفی اور صاحبِ دل شاعر[1] کے اس شعر کی ترجمان ہے جس کی سماعت پر محفل سماع میں اہلِ تصوف اور اصحاب طریقت کئی گھنٹے تک عالم وجد میں رقص کناں رہے۔

عالم تمام آئینۂ حسن دوست ہے
لیکن نصیب وُسعتِ ذوقِ نظر نہیں

مولانا جلال الدین رومی کو یہ ''وسعت ذوق نظر'' صرف اور صرف ایک صوفیٔ باصفا، ایک درویش کامل اور ایک مجذوب وقت..... حضرت شمس تبریز کی بدولت حاصل ہوئی اور ایسی کہ سطح سمندر کی لہروں کی طرح یہ پھیلتی چلی جارہی ہے تالاحدّ نگاہ، تا کنارِ بیکراں!

میں نے ہر تین چار سطروں کے بعد اشعار رومی درج کرنے کے مروجہ اصول سے انحراف کیا ہے، اس لیے کہ اشعار کے اندراج سے تحریر کی روانی میں اٹکاؤ پیدا ہونے لگتا ہے اور لکھنے والا جس جذبۂ خلوص کے ساتھ رومی کے افکار و نظریات کو اجاگر کرنا چاہتا ہے، اس میں شعری اندراج سدراہ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا مقصد مولانائے روم کے کلام کی تشریح و تفسیر نہیں، ایک جائزہ ہے اور قاری کے ذوق کی تسکین کے لیے سولہویں باب میں کلام رومی کا انتخاب درج کیا جارہا ہے۔ البتہ چلتے چلتے دل میں یہ خواہش بے طرح انگڑائی لے رہی ہے کہ مثنوی کا وہ حصہ پیش کردوں جہاں ''زبان'' بے وجہ باہمی مخاصمت اور نزاع کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے تعصب اور تنگ نظری کے زیر اثر آپس میں جو تم پیزار ہو جاتے ہیں اور کشت و خون کا اندوہگیں نظارہ آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جاتا ہے۔
(پاکستان میں اس کی متعدد مثالیں سامنے آئی ہیں۔)

مثنوی کا مذکورہ حصہ درج کرنے سے قبل ایک حدیث مبارکہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

وَھُوَ ھٰذَا :

---

1 مولانا شاہ منظور الرحمٰن اخنز کاکوی مرحوم اُردو کی مشہور کتاب ''بزم صوفیہ'' کے مصنف سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے عزیز اور ہم مکتب تھے۔ مولانا نے کامل پچاس سال تک عیدین کی امامت کے فرائض انجام دیئے۔ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا۔ زندگی کی آخری امامتِ عید سے تین دن پہلے 27 رمضان المبارک کو رحلت فرما گئے۔

Marfat.com

اِطْلِبُوا الْعِلْم وَلَو کَانَ فِی السّینO

(علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین کا سفر کرنا پڑے۔)

مذکورہ حدیث مبارکہ کے مطالعہ کے بعد پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ کہاں حجاز مقدس اور کہاں چین؟ فاصلہ طویل، راستہ دشوار گزار، وسائل محدود، مواصلاتی نظام عنقا! لیکن حصولِ تعلیم کے لیے اللہ کے آخری نبیؐ نے یہ سب مصائب برداشت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اور انہی مصائب میں ایک ''زبان'' کا مسئلہ بھی ہے۔ ظاہر ہے اہل حجاز عرب تھے، عربی زبان بولتے تھے، انہیں اپنی زبان پر فخر و ناز تھا۔ وہ اپنے سوا، دنیا کے تمام انسانوں کو ''عجمی'' یعنی گونگا کہتے تھے۔

اور ان ہی لوگوں کو اہل عجم کے پاس جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے، اہل چین سے (جو زمانۂ قدیم سے اپنی فکر و دانش میں ممتاز و معروف تھے) علم (یعنی حکمت و دانش مندی) حاصل کرنے کے لیے ان کی زبان سیکھنی لازمی تھی۔ اس طرح آنحضرتؐ نے حصولِ علم کے ساتھ ساتھ حصول زبان کی تاکید بھی فرمائی ہے۔ گویا آپؐ کی نظر میں ہر زبان بولنے والا اپنی جگہ مقتدر تھا[1] اور اس طرح اس کی عزت و توقیر لازمی تھی۔

اب مثنوی ملاحظہ فرمائیں:

چار کس را داد مردے یک درم
ہر یکے از شہرے افتادہ بہم
فارسی و ترک و رومی و عرب
جملہ باہم در نزاع و در غضب
فارسی گفتا ازین چون وارھیم
ہم بیا کایں را بہ انگورے دھیم
آن عرب گفتا معاذاللہ لا
من عنب خواہم نہ انگور اے دغا

1 قارئین! آنحضرتؐ کا یہ فرمان آج سے سوا چودہ سو سال پہلے کا ہے...... اور اب، اکیسویں صدی میں ہم زبان کے مسئلے پر باہمی نفرت، کدورت، تعصب مخاصمت اور مخالفت کے شکار ہیں۔ آپس میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں۔ کاش مولانا روم کی مثنوی کا مذکورہ حصہ دنیا کی جملہ جامعات کے نصاب میں شامل کیا جاتا۔

Marfat.com

آن یکے کز ترک بد گفت اے کزم
من نمی خواہم عنب خواہم ازم[1]
آن کہ رومی بود گفت این قیل را
ترک کن خواہم من استافیل[2] را
در تنازع مشت برہم می زدند
کہ ز سرِّ نام ھا غافل بدند
صاحبِ سرّے عزیزے صد زبان
گربدے آنجا بدادے صلح شان
پس بگفتے او کہ من زین یک درم
آرزوئے جملہ تان را می خرم
یک درم تان می شود چار المراد
چار دشمن میشود یک ز اتحاد

(چار مختلف ملکوں کے چار آدمی یک جا تھے۔ان میں ایک ایرانی تھا، ایک ترک تھا، ایک روم کا رہنے والا تھا اور ایک عرب تھا۔انہیں ایک شخص نے ازراہ التفات ایک درم دیا۔ان کے درمیان اس بات پر جھگڑا شروع ہوا کہ اس ایک درم کو کس کام میں خرچ کیا جائے۔چنانچہ یہ مکالمہ ہوا:

ایرانی : انگور منگوائے جائیں۔
عرب : ہرگز نہیں، بلکہ عنب خریدا جائے۔
رومی : یہ بھی نہیں، بلکہ استافیل آنا چاہیے۔
ترک : نہیں، یہ سب نہیں، بلکہ ازم منگوایا جائے۔)

مولانا رومی اس حکایت کے ذریعے یہ باور کرانا چاہ رہے ہیں کہ چاروں اشخاص کا مدعا ایک ہی ہے، یعنی انگور منگوانا۔البتہ وہ اس کا نام اپنی اپنی زبان میں لے رہے ہیں اور ایک دوسرے کی زبان نہ

---

1 انگور 2 انگور

جاننے کی وجہ سے ان کے درمیان جھگڑا اور فساد برپا ہے۔ اگر یہ چاروں آدمی ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوتے تو پھر نزاع کی صورت نہ پیدا ہوتی۔ گویا مولانائے روم نے اس واقعے کی صورت میں زبان دانی کی اہمیت اجاگر کر دی ہے اور موجودہ دور کی اس حقیقت کو طشت از بام کر دیا ہے کہ مختلف قبیلوں، قوموں اور علاقائی باشندوں کی زبان جاننے سے رشتۂ اخوت ہموار ہوتا ہے اور باہمی تعلقات کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

مذکورہ حکایت کی روشنی میں ہم اگر جائزہ لیں کہ کم از کم اسلامی ممالک میں بولی جانے والی زبانوں، مثلاً فارسی، ترکی، عربی، بنگلہ وغیرہ سے ہم کما حقہ واقف ہیں تو یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ اسی طرح پاکستان کی علاقائی زبانوں پنجابی، سندھی، پشتو، سرائیکی، ہندکو، براہوی، بلوچی وغیرہ سے ہم بخوبی آشنا ہیں تو اس کا جواب بھی حوصلہ شکن ہی ہوگا..... پھر قومی وحدت، قومی یک جہتی اور ملکی یگانگت کس طرح برقرار رہے گی۔ یہ ایک اہم سوالیہ نشان ہے اور مولانا روم کی اس حکایت میں اس کا شافی جواب مضمر ہے۔

صرف یہی نہیں، زندگی کے متنوع پہلوؤں کو اور روزمرہ کے گوناگوں مسائل کو جس منطقی انداز اور مؤثر طریقے سے مولانا نے اپنی مثنوی میں پیش کر کے حل کرنے کی سعی کی ہے اور بھٹکے ہوئے راہی کو راستے کی پُرخطر کھائیوں میں گرنے سے بچانے کے لیے استدلالی، اخلاقی، سماجی، مذہبی اور روحانی طرز تکلم اختیار کیا ہے اور جنسی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کا نفسیاتی طریقہ استعمال کیا ہے، وہ ایک احسانِ عظیم ہے انسان پر، انسانیت پر اور جملہ اقوام وملل پر! اس طرح ان کا مقام حد درجہ ارفع واعلیٰ بن گیا ہے اور ''مثنویٔ معنوی'' مندرجۂ ذیل اعزاز کی فی الواقع اہل ہے:

ہست قرآن در زبانِ پہلوی

Marfat.com

اقبال، مسجد قرطبہ اور مولانائے روم

پیر رومیؔ خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

ز رومیؔ گیر اسرار فقیری
کہ آن فقر است محسود امیری

پیر رومیؔ آں امامِ راستان
آشنائے ہر مقامِ راستان

(اقبال)

علامہ اقبال کے مذکورہ بالا اشعار اس حقیقت کا برملا اظہار کر رہے ہیں کہ انہیں مولانا جلال الدین رومیؔ سے اس درجہ عقیدت تھی جو ایک مرید کو پیر سے ہوا کرتی ہے۔ اور یہ بات اقبالیات کے ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ علامہ نے ''مثنویٔ معنوی'' کے خالق کو ہمیشہ ''پیر رومی'' کے عقیدت مندانہ لہجے سے مخاطب کیا۔ پھر موصوف نے نہ صرف فکر رومی کی روشنی میں اپنا سخنورانہ سفر طے کیا بلکہ اپنے اُردو اور فارسی کلام کے ذریعے مولانائے روم کے بلند و بالا نظریات اور ارفع و اعلیٰ خیالات کی تبلیغ

Marfat.com

بھی کی۔ہم انہیں بلاشک وشبہ ''ترجمانِ رومی'' اور ''مفسرِ رومی'' قرار دے سکتے ہیں۔

علامہ اقبال کو مولانا سے اس درجہ عقیدت تھی کہ اپنی وفات سے قبل (1935 میں) حکیم محمد حسین کو ایک خط لکھ کر اس جانب یوں اشارہ کیا ہے؟

''میں ایک مدت سے مطالعۂ کتب ترک کر چکا ہوں۔اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنویٔ رومی۔''

غور کیجیے کہ پوری دنیائے اسلام میں علامہ کی شاعری نشاۃ الثانیہ کا درجہ رکھتی ہے۔وہ خود فکر اسلامی کے مسلّم الثبوت داعی تھے۔قرآن حکیم کا مطالعہ ہمیشہ ان کا معمولِ زندگی رہا۔اور زندگی کے آخری برسوں میں جب کبھی مطالعہ کی سکت ہوئی تو قرآن پڑھا یا مثنویٔ معنوی!.....آخر علامہ کو مثنوی سے اس درجہ شغف کیوں تھا کہ اس کے پیش کردہ نظریے کی نہ صرف پیروی کی بلکہ وہ پیغام رومی کے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''نہایت ہی مؤثر پرچارک قرار پائے۔'' اس عقیدت وارادت کی تمام تر وجہ ایک خواب ہے، جس کا ذکر علامہ نے بقول مولانا صلاح الدین احمد اس طرح کیا تھا:

''مجھے خواب میں مولانائے روم کی مثنوی پڑھنے کی باقاعدہ ہدایت ہوئی تھی۔''

مذکورہ بالا خواب سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ موصوف کو باقاعدہ اس بات کی ہدایت ہوئی تھی کہ وہ مثنویٔ معنوی کا بطور خاص مطالعہ کریں۔لیکن اقبالیات کے ماہرین کو اس حقیقت کا تاہنوز اندازہ نہ ہوسکا کہ علامہ نے یہ خواب کہاں دیکھا، کس طرح دیکھا اور کیوں کر دیکھا۔راقم الحروف نے اس ضمن میں روزنامہ ''جنگ'' میں ایک طویل مضمون لکھا تھا اور مذکورہ خوابِ اقبال کا ذکر ایک ایسے راوی کی وساطت سے کیا تھا جو ہر طرح قابل اعتماد تھا۔طرفہ تماشا یہ کہ اقبالیات کے مرد میداں اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں شعبۂ اقبالیات کے سابق چیئرمین ڈاکٹر رحیم بخش شاہین مرحوم نے اپنی تصنیف ''اوراقِ گم گشتہ'' میں اسے من وعن نقل کر دیا تھا۔علامہ اقبال کے فرزند رشید ڈاکٹر جاوید اقبال نے میرے اسی مضمون کو روزنامہ ''جنگ'' سے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں نقل کر کے یہ حکم لگایا تھا کہ یہ واقعہ غلط ہے۔میں یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ روایت اور درایت کی بنیاد پر پوری اسلامی تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا ہے، تو پھر مسجد قرطبہ کا واقعہ اور خواب میں مولانائے روم کی آمد وتلقین سے لاتعلقی آخر

Marfat.com

کیوں؟ پھر، علامہ خود بھی خواب کے ذریعے مطالعۂ رومی کے لیے دی جانے والی ہدایت کا برملا ذکر کر رہے ہیں۔ اب فیصلہ قارئین خود کریں گے کہ کیا پروفیسر امتیاز محمد خان جیسا مؤرخ اور ماہر تعلیم غلط بیانی سے بھی کام لے سکتا ہے۔ بہر حال مذکورہ مضمون پیش خدمت ہے۔

○○○

قرطبہ سے کون واقف نہیں۔ یہی وہ شہر تھا جہاں مسلمانوں کی عظمت وسطوت کا پرچم سات سو سال تک نہایت آن بان کے ساتھ لہراتا رہا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے علم کی روشنی پھوٹتی تھی اور اکتساب نور کے لیے یورپ جیسے تیرہ وتار خطے سے لوگ جوق در جوق آیا کرتے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اسلامی تہذیب وتمدن کے چشمے رواں تھے۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں فکر وفن کے ان گنت ستارے جھلملاتے تھے۔

اسی قرطبہ میں ایک ایسی عظیم الشان مسجد تعمیر کی گئی تھی جس کی مثال پورے کرۂ ارض میں کہیں نہیں ملتی۔ فن تعمیر کا یہ وہ شاہکار ہے جس پر خود انسان حیران وششدر دکھائی دیتا ہے۔ اسی مسجد سے متعلق علامہ اقبال کی ایک معرکۃ الآرا نظم ''بال جبریل'' میں شامل ہے جسے انہوں نے بقول خود

''ہسپانیہ کی زمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی۔''

علامہ اقبال کو قرطبہ جانے کا اتفاق 1933ء میں ہوا تھا۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جب وہ 1932ء میں لندن گئے تھے، وہیں سے پیرس ہوتے ہوئے ہسپانیہ بھی پہنچے تھے۔ اسی سفر کے دوران وہ قرطبہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں اسلامی دور اقتدار کی زندہ وتابندہ نشانی مسجد قرطبہ دیکھی۔ مشہور ہے کہ علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ میں اذان دی تھی اور نماز بھی پڑھی تھی۔ اس ضمن میں علامہ کے ایک دیرینہ نیاز مند فقیر سید وحید الدین اپنی کتاب ''روزگار فقیر'' (حصہ دوئم) میں لکھتے ہیں:

''حکیم الامت علامہ اقبال تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد اسپین بھی گئے اور وہاں اسلامی دور اقتدار ختم ہونے کے تقریباً سات سو سال بعد انہوں نے مسجد قرطبہ میں پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی۔'' (ص 411)

فقیر وحید الدین کے مندرجۂ بالا بیان کو پڑھنے کے بعد قاری یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اذان دینے اور نماز پڑھنے کا سارا عمل نہایت سکون وطمانیت کے ساتھ انجام پایا ہوگا، اور وہ بھی ایسی

صورت میں جبکہ مؤذن اور نمازی (اقبال) کا دل اسلام کی محبت سے سرشار تھا اور سامنے عظمتِ رفتہ کی منہ بولتی تصویر نظر آ رہی تھی۔ یہ مقدس فریضہ جس خشوع وخضوع کے ساتھ انجام پایا ہوگا، وہ اظہر من الشمس ہے۔

اُردو کے مشہور صحافی، ادیب اور شاعر جناب عبدالمجید سالک اپنی کتاب ''ذکر اقبال'' میں اسی واقعے سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> ''علامہ اقبال نے بے اختیار چاہا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں۔ اس عمارت کے نگران سے پوچھا۔ اس نے کہا میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں۔ اُدھر وہ پوچھنے گیا، اِدھر علامہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی پہلے نماز سے فارغ ہو گئے۔'' (ص 182)

عبدالمجید سالک صاحب کی تحریر سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ میں نماز بہ عجلت ادا کی، مبادا نگراں آ کر انہیں اس کام سے روک دے۔

درج بالا دو واقعات کے بعد قاری لازماً الجھن میں پڑ جائے گا کہ کسے مانے اور کسے نہ مانے۔ پھر جبکہ علامہ کی ایک تصویر مسجد قرطبہ میں باقاعدہ مصلّے پر بیٹھ کر نماز ادا کرتے ہوئے کھینچی گئی ہے۔ عالم عجلت میں تو اس طرح کی تصویر کشی آج سے 75/70 سال پہلے ممکن نہ تھی ع

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ooo

اسی ہنگامے کے پیش نظر آج میں مسجد قرطبہ میں علامہ اقبال کے باقاعدہ داخل ہونے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور دوسرے اہم راز کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ علامہ اقبال نے خود یہ واقعہ جس شخص کو سنایا تھا، اور جس سے میں نے (دیگر افراد کے ساتھ[1]) سنا، وہ کئی سال ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس واقعہ کی صداقت کے بارے میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ اسے پروفیسر امتیاز محمد خاں جیسی شخصیت نے خود بیان کیا تھا۔

قارئین پوچھ سکتے ہیں کہ یہ امتیاز محمد خاں کون تھے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ وہ آگرہ کے

---

1 ان افراد کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

Marfat.com

رہنے والے تھے۔لندن سے انہوں نے تاریخ میں بی اے (آنرز) اور ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ وہاں سے واپسی کے بعد غیر منقسم ہندوستان کے مشہور علمی ادارے 'ریلوے ہائی اسکول' داناپور (بہار) کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ واضح رہے کہ یہ وہ اسکول ہے جہاں جسٹس سید شرف الدین[1]، سر علی امام[2]، حسین امام[3] وغیرہ نے تعلیم پائی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد خان صاحب موصوف بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی خصوصی ہدایت پر پاکستان آ گئے۔ انہیں حکومت نے کراچی اور بلوچستان کا ناظم تعلیمات مقرر کیا۔ خان صاحب ایک طویل عرصے تک بطور ناظم تعلیمات خدمات انجام دیتے رہے۔ سنہ ساٹھ کے ابتدائی عشرے میں قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے انہیں جناح کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ وہ اس تعلیمی ادارے کی صدر تھیں اور جناح کالج کو معیاری بنانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔

پروفیسر امتیاز محمد خاں کے بے شمار بصیرت افروز، محققانہ اور تاریخی نوعیت کے مضامین بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اُردو (پاکستان) کراچی کے مشہور و معروف سہ ماہی مجلّے ''اُردو'' میں شائع کیے تھے، مثلاً

- دولتِ عثمانیہ کا نظم حکومت
- عہدِ عثمانیہ کے علمائے دین
- عثمانی ترکوں کے عہد میں فن مصوری

امتیاز محمد خاں مرحوم ایک مؤرخ اور ماہر تعلیم ہی نہ تھے، انہیں مثنویٔ مولانائے روم سے بھی

---

1 جسٹس سید شرف الدین داناپور سے قریب کی بستی نیورہ کے رہنے والے تھے اور اُردو کے نامور محقق، شاعر، حکیم اور ''کاشف الحقائق'' کے مصنف نواب امداد امام اثر کے قریبی عزیز تھے۔ جسٹس صاحب کلکتہ اور پٹنہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ یہ مشہور بزرگ حاجی وارث علی شاہ کے مرید تھے۔ سلسلۂ وارثیہ کے ان بزرگ نے قتل کے ایک پیچیدہ مقدمے کا فیصلہ اس وقت ٹرین میں انہیں لکھوا دیا تھا جو جسٹس صاحب کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ سید صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کی تھی جو دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا تھا اور جس کے اختتام پر آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آئی تھی۔ اس سے قبل لکھنؤ میں ایک مجلس منعقد ہوئی تھی۔ اس کی صدارت بھی جسٹس شرف الدین نے کی تھی۔ وہیں یہ طے ہوا تھا کہ کانگرس کے بالمقابل مسلمانوں کی بھی ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ اس طرح مسلم لیگ کی تشکیل ہوئی جو قیام پاکستان کا سبب بنی۔

2 سر علی امام، نواب امداد امام اثر کے صاحبزادے اور نامور قانون داں تھے۔ پریوی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم بھی رہے۔ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور قائداعظم کے عزیز دوست تھے۔

3 حسین امام، سر علی امام کے چھوٹے بھائی اور نامور قانون داں تھے۔

Marfat.com

والہانہ لگاؤ تھا۔ فارسی داں ہونے کی وجہ سے وہ مثنویٔ معنوی کے جملہ اسرار ومحاسن سے آگاہ تھے۔ جب فروری 1962ء میں، میں جناح کالج کی اُردو لیکچرر شپ اور ''جناح کالج میگزین'' کی ادارت چھوڑ کر ڈاکٹر محمود حسین خاں کے قائم کردہ جامعہ تعلیم ملّی کالج، ملیر (کراچی) جارہا تھا، اس موقع پر خاں صاحب نے ازراہ شفقت ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقع پر موصوف نے مولانا روم کی مثنوی کو فلم پروجیکٹر کے ذریعے پیش کرنے کا خصوصی انتظام کیا تھا۔ وہ یوں کہ پردے پر نہایت خوش خط لکھی ہوئی مثنوی نمایاں ہوتی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مشہور مفکر اور عالم دین مولانا شاہ جعفر پھلواروی[1] کی دلنشیں آواز ابھرتی اور ہر مصرع کانوں میں رس گھولتا ہوا محسوس ہوتا۔ گویا سمعی وبصری دونوں طرح سے مثنویٔ مولانا روم حاضرین کو مسحور کررہی تھی۔ پروفیسر امتیاز محمد خان نے مولانا جلال الدین رومی کے شہکار کو اثر انگیز انداز میں پیش کرنے کی طرح ڈالی تھی۔

میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ جناح کالج کے وسیع ہال میں افطار اور کھانا، دونوں کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں جناح کالج کے اساتذہ اور بعض ذہین اور سینئر طلبا بھی شریک تھے۔ اس موقع پر امتیاز محمد خاں صاحب نے مسجد قرطبہ کے حوالے سے علامہ محمد اقبال کا جو ذکر کیا تھا، اس کے سامعین میں مندرجۂ ذیل حضرات بھی شامل تھے:

1 میاں ریاض الدین، جناح کالج کے سیکرٹری۔

2 سلمان احمد علی (لیکچرر انگریزی)۔ اس وقت کراچی کی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک ہیں۔

3 شیخ وقار حسین (لیکچرر سائنس)۔ اس وقت نیشنل کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔

4 سید ایم انور (لیکچرر، پولیٹیکل سائنس) اس وقت کراچی میں میگرا ھل بک کارپوریشن کے ریجنل منیجر ہیں۔

5 نصیر ترابی (سال دوئم کے طالب علم)۔ مشہور دینی شخصیت علامہ رشید ترابی کے صاحبزادے اور

---

1 مولانا شاہ جعفر پھلواروی صوبہ بہار کے ایک قدیم اور تاریخی شہر پھلواری کے رہنے والے تھے۔ آپ وقت کے جید عالم دین اور صوفیٔ باصفا شاہ سلیمان پھلواروی کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ واضح رہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں شاہ سلیمان پھلواروی نے تقریر اور وعظ کے ذریعے آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کو بیان کرنے کی طرح ڈالی تھی اور پورے برصغیر میں آپ اس خدمت کے بدولت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ علامہ اقبال اور شاہ سلیمان پھلواروی کے مابین گہرے مراسم تھے۔ دینی مسائل کے ضمن میں جب بھی کسی دشواری کا سامنا ہوتا، علامہ اقبال حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتے۔ تقسیم کے بعد شاہ جعفر پھلواروی لاہور آگئے تھے۔ مشہور صحافی اور موتمر عالم اسلامی پاکستان کے صدر مولانا حسن مثنیٰ ندوی شاہ جعفر کے بڑے بھائی حسن میاں کے فرزند تھے۔

Marfat.com

اُردو کے خوشگو شاعر۔

6 منور غنی (ڈیمونسٹریٹر) وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد جسٹس نورالعارفین کے ساتھ کام کیا۔ اس وقت کراچی کے مشہور وکیل ہیں۔

مذکورہ دعوت کے موقع پر کراچی وکوئٹہ کے پہلے ناظم تعلیمات اور جناح کالج کے پرنسپل امتیاز محمد خاں نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

''علامہ اقبال نے بھی مثنویٔ مولانا روم بغور پڑھی تھی اور اس کا اثر قبول کرنا لازمی تھا۔ یہ بات تو صحیح ہے۔ مگر اس سلسلے میں ایک اہم راز بھی پوشیدہ ہے۔ آیئے، آج میں آپ کو علامہ اقبال کی زندگی کا یہ راز بتاتا ہوں۔''

اتنا کہنے کے بعد خان صاحب نے مجمع پر ایک مشفقانہ نظر ڈالی اور یوں گویا ہوئے:

''مجھے مثنویٔ مولانائے روم سے طالب علمی کے زمانے سے ہی شغف رہا ہے۔ جب میں نے علامہ اقبال کے اُردو اور فارسی کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تو وہاں بھی یہی رنگ غالب نظر آیا۔ لہٰذا مجھے علامہ سے بھی بے پناہ عقیدت ہوگئی۔ جب میں نے علامہ سے ان کی زندگی کے آخری دنوں میں ملاقات کی تو دوران گفتگو مولانا روم کا ذکر آیا، ان کی مثنویٔ معنوی کا تذکرہ ہوا اور پھر اقبال کی شاعری پر ان سب کے اثرات کی بات چل نکلی۔ اس موقع پر علامہ نے اپنی زندگی کی ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا جس کا تذکرہ نہ کسی کتاب میں ملتا ہے نہ کسی مضمون نگار نے کہیں ذکر کیا ہے۔''

اتنا کہنے کے بعد پاکستان کے ماہر تعلیم، مؤرخ اور ذی قدر استاد امتیاز محمد خاں مرحوم نے علامہ اقبال کی زبانی رمضان المبارک کے آخری عشرے کی رات جو واقعہ بیان کیا تھا اور جس کے سامع و شاہد آج بھی کراچی میں موجود ہیں، اسے میں یہاں من وعن تحریر کر رہا ہوں:

''جب میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گیا تو اس دورانِ سفر میرا بے طرح جی چاہا کہ اسلامی دور کی قدیم نشانی اسپین کو بھی جا دیکھوں، خصوصاً الحمراء اور مسجد قرطبہ کی پُرشکوہ عمارات کا مشاہدہ بھی کروں۔ یہ خیال آنا تھا کہ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ مسجد قرطبہ کو دیکھنے کا موقع تو مل جائے گا مگر وہاں نماز کس طرح ادا کر سکوں گا۔ اس لیے کہ جب ہسپانیہ میں غیر مسلموں کی حکومت قائم ہوئی اور ایک دوسرا آئین نافذ ہوا تو وہاں کا پہلا قانون یہ تھا

کہ مسجد قرطبہ میں نہ تو اذان دی جائے گی نہ ہی نماز ادا کی جائے گی اور اسی قانون کے نفاذ کے بعد اس عظیم الشان مسجد کو گرجا بنا دیا گیا۔"

یہ کہنے کے بعد امتیاز محمد خاں صاحب رکے، چائے کی چسکی لی اور علامہ کی بات دہرانے لگے:

"اس قانون کا خیال آتے ہی دل رونے لگا۔ میں مسجد میں داخل ہو کر بھی دو رکعت نماز تک ادا نہ کر سوں گا۔ اس سلسلے میں، میں نے ایک انگریز دوست کی مدد حاصل کی۔ اس نے حکومت ہند کے ہوم سیکرٹری کو خط لکھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حکومت ہسپانیہ کے ہوم سیکرٹری کو خط لکھ کر اس بات کی اجازت حاصل کرے کہ ڈاکٹر محمد اقبال سفرِ قرطبہ کے دوران مسجد قرطبہ میں باقاعدہ نماز ادا کر سکے۔ چنانچہ یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی اور مجھے اجازت مل گئی۔ مگر ایک شرط کے ساتھ! قانون، قانون ہوتا ہے۔ اس کو توڑنا بھی آسان نہیں! لہٰذا یہ طے پایا کہ جب میں مسجد قرطبہ کے اندر داخل ہو جاؤں تو دروازہ بند کر دیا جائے اور اس پر قفل لگا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مسجد کے اندر داخل ہو کر میں نے اپنی آواز کی پوری شدت کے ساتھ اذان دی۔ میں اس جذبے، اس سُرور اور اس کیف کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ سالہا سال کے بعد مسجد قرطبہ کے اندر پہلی مرتبہ اللہ اکبر کی آواز محراب و منبر سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھی۔

اذان سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مصلّٰی بچھایا اور نماز ادا کرنے لگا۔ دوران نماز مجھ پر اس قدر رقّت طاری ہوئی کہ میں گریہ وزاری برداشت نہ کر سکا اور جب سجدے میں گرا تو بے ہوش ہو گیا۔ اسی دوران میں نے عالم رویا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں:

"اقبال! تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ۔"

جب میں ہوش میں آیا تو دل کو سکون حاصل ہو چکا تھا..... اس کے بعد میں تھا اور مطالعۂ مثنوئ مولانائے روم!"

علامہ اقبال کی زبانی ان کا یہ اہم واقعہ بیان کرنے کے بعد امتیاز محمد خاں مرحوم یکلخت خاموش ہو گئے۔ اس وقت ان کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر تھیں ع

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں!

Marfat.com

قلم کاروں کا خراجِ عقیدت

مولانا جلال الدین رومی سے اکتسابِ نُور کرنے والے، ایک نہیں ہزار تھے۔ ہر زمانے میں قلمکاروں نے مولویٔ معنوی کے حضور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ دراصل اس جذبۂ خلوص کا مظہر ہے جو قونیہ کے اس شاعرِ بے بدل کے لیے ان سبھوں کے نہاں خانۂ دل میں موجزن رہا ہے۔ یہ بھی گویا مولانا کی سربلندی کا ایک راز ہے کہ ہر قوم، ہر فرقہ، ہر ملک اور ہر دیار کے رہنے والے قلمکاروں نے موصوف کی ذاتِ گرامی، اُن کے ارفع و اعلیٰ نظریات اور اُن کے پیش کردہ اشعار کی معنویت، وسعت اور حسّاسیت سے متاثر ہو کر نذرانۂ خلوص پیش کیا ہے۔ ایسے تاثرات بے شمار ہیں، لیکن تنگ دامانیٔ کتاب کے پیشِ نظر چند ایک بطور نمونہ از خروارے پیش کئے جا رہے ہیں:

علامہ شبلی نعمانی

کسی کتاب کی مقبولیت دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ سادگی اور صفائی اور عام دلآویزی کی وجہ سے پہلے وہ کتاب عوام میں پھیلتی ہے، پھر رفتہ رفتہ خواص بھی اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور مقبول عام ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتاب عوام کی دسترس سے باہر ہوتی ہے، اس لئے صرف خواص کی نظر پڑتی ہے۔ خواص جس قدر زیادہ اس پر توجہ کرتے ہیں، اسی قدر اس میں زیادہ نکات

Marfat.com

اور دقائق پیدا ہو جاتے ہیں۔ خواص کی توجہ اور اعتنا و تحسین کی وجہ سے عوام میں بھی چرچا پھیلتا ہے اور لوگ تقلیداً اس کے معتقد اور معترف ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ دائرہ تمام ملک کو محیط ہو جاتا ہے۔ مثنوی کی مقبولیت اسی قسم کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی مقبولیت اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم و نثر میں لکھی گئی ہیں، کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

فارسی پر موقوف نہیں، اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتہ لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر علماء اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ ''ہست قرآں در زبان پہلوی'' تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔

رضازادہ شفق

مشرق و مغرب کے ناقدوں کی رائے کے مطابق مولانا رومی غالباً دنیا کے اور یقیناً ایران کے سب سے بڑے صوفی شاعر ہیں۔ ان کا دیوان غزلیات جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے، عشقیہ اور عرفانی کیفیات سے پُر ہے۔ غزلیات میں عرفانی اور صوفیانہ نکات جا بجا نظر آتے ہیں۔ لیکن مولانا کی صوفیانہ شاعری اور ان کی عظمت ان کی مشہور و معروف مثنوی کے باعث ہے۔

مثنویٔ معنوی مولانا جلال الدین کے افکار گراں بہا کا ثمرہ اور ان کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے۔ بلکہ یہ فارسی زبان میں تصوف کا مکمل ترین دیوان ہے۔ اس میں چھ دفتر ہیں اور اشعار کی تعداد چھبیس ہزار ہے جو بحر رمل میں کہے گئے ہیں۔

مقبول بیگ دُرخشانی

مولانا روم کی مثنوی سے پہلے کی مثنویوں میں عموماً یہ طریق اختیار کیا جاتا کہ عنوان قائم کر کے اس پر اظہار خیال کیا جاتا تھا اور موضوع و مضمون کی وضاحت کے لیے حکایات بیان کی جاتیں۔ حکیم سنائی اور خواجہ عطار کا یہی انداز ہے۔ لیکن مثنویٔ رومی میں اس طرح کی ترتیب نہیں۔ دفتروں کی تقسیم موضوعات کے لحاظ سے نہیں کی گئی ہے۔ مولانا روم تمام حکایت شروع کر دیتے ہیں اور جہاں موقع ملتا

Marfat.com

ہے، عرفانی نکات پیش کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات حکایت بیان کی جا رہی ہوتی ہے اور درمیان میں طویل عرفانی مضامین بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے بعد پھر حکایت جاری رہتی ہے۔ اس طرح قاری حکایت کی دلچسپی میں اصل مقصود کو بھی پا لیتا ہے۔

مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا کا طرز استدلال ہے۔ وہ مشکل اور عمیق موضوعات اور مضامین کو حکایتوں، تمثیلوں اور تشبیہوں سے قارئین پر روشن کر دیتے ہیں۔

مولانا ہدایت و تعلیم کو سخن پردازی اور شاعری سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے پیش نظر عالم و عارف بھی ہیں اور مبتدی و عامی بھی! اس لیے وہ زبان ایسی استعمال کرتے ہیں جو سب کی سمجھ میں آ سکے۔ نیز، مولانا نے اپنے فلسفیانہ شعور اور شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت اس طریق تعلیم کو کمال کے مرتبے تک پہنچایا۔

علامہ اقبال

مرشد رومی حکیم پاک زاد سر مرگ و زندگی بر ما کشاد

پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر

نور قرآں درمیانِ سینہ اش جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

راز معنی مرشد رومی کشود فکر من پر آسائش در سجود

پیر رومی را رفیق راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
شرح او کردند و او را کس ندید معنی او چوں غزال از ما رمید

Marfat.com

رقص تن از حرف او آموختند چشم را از رقص جان بردوختند

گسستہ تار ہے تیری خود کا ساز ابتک کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بہ کف

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی
ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحر پُرآشوبِ و پُراسرار ہے رومی

مرا بنگر کہ در ہندوستاں نمے بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریزست

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

مثنوی کی سلاست، روانی اور برجستگی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بعد بکثرت شعراء نے اس کا تتبع کیا اور علامہ اقبال نے خاص طور پر اس مثنوی کی پیروی میں کئی مثنویاں لکھیں اور اس مثنوی سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے ''فلسفۂ سخت کوشی'' کی تبلیغ بھی کی۔ علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' جو مولانا ہی کی زمین میں ہے، مولانا کے دیوان کے ان اشعار سے شروع ہوتی ہے ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دو ملولم و انسانم آرزو ست
زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزو ست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

یعنی کل ایک بزرگ دن کے وقت چراغ لیے گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں حیوانوں سے تنگ آ گیا ہوں اور میں انسانوں کو ڈھونڈتا ہوں۔ میں اپنے سست ساتھیوں سے تنگ آ گیا ہوں اور میں شیر خدا اور رستم کی تلاش کر رہا ہوں۔

لوگوں نے کہا ہم تو بہت ڈھونڈ چکے، انسان تو کہیں ملتا نہیں۔ وہ بزرگ بولا کہ ''جو نہیں ملتا اسی کو تو ڈھونڈتا ہوں۔'' چنانچہ یہی سخت کوشی، پیہم جستجو، مسلسل تلاش رومی کا خاص پیام ہے۔ جس کا خلاصہ ایک مصرع میں آ گیا ہے ع

کوششِ بے ہودہ بہ از خفتگی

یعنی اگر یہ بھی معلوم ہو کہ اب کوشش کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا تب بھی کوشش کرنی چاہیے جو سو رہنے سے بہتر ہے۔ یعنی زندگی اور زندہ رہنے کا ثبوت ہی کوشش میں مصروف رہنا ہے۔

پروفیسر سید عابد علی عابد

یہی مثنوی کا موقف ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہیں، یہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ مولانا روم نے شخصاً تمام احکام شرعی کی پابندی کر کے صحیح تصوف کی حد بندی کر دی اور یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ جو صوفی احکام شریعت پر عمل نہیں کرتا، وہ اپنے قلب کے مجلّٰی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اگر واقعی اس کا قلب ہوتا تو تمام احکام شریعہ کی پابندی وہ اپنے لیے لازم قرار دیتا۔

مولانا روم کی مثنوی کے بعد متصوفانہ شاعری میں کسی نئی اہم چیز کا اضافہ نہیں ہوا۔ جامی

Marfat.com

تک وہی اسرار و رموز دہرائے جاتے رہے جو مثنوی میں پائے جاتے ہیں۔ یہی مثنوی کے تفوق کی دلیل قطعی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

مولانا جلال الدین رومی تشبیہہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں۔ وہ اخلاقی و روحانی مسائل کو سلجھانے کے لیے اگرچہ ایک حد تک منطقی استدلال بھی کرتے ہیں، لیکن جب وہ کسی تشبیہ یا مثال کے ذریعے سے مطلب کو واضح کرتے ہیں تو بات زیادہ دلنشیں اور یقین آفریں ہوتی ہے۔

ان کی مثنوی حکمت و عرفان کا بحرِ ذخار ہے۔ اور ان کے بیان میں استدلال اور ذاتی وجدان ہم آغوش ہیں اور فطرت نے ان کو یہ غیر معمولی ملکہ عطا کیا ہے کہ ہر باریک نکتے کی وضاحت کے لیے ان کو دلنشیں تشبیہ سوجھتی ہے جو یقین آفریں بھی ہوتی ہے اور وجد آور بھی!

ڈاکٹر قاسم صافی

سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیاں افکار مثنوی کی اشاعت اور دنیا میں مولانا کے اثر و رسوخ کے پھیلنے میں مانع نہ ہو سکیں۔ مولانا کے آثار نے سب سے زیادہ برصغیر کو متاثر کیا۔ بلا مبالغہ برصغیر کی جتنی زبانوں میں مثنوی کی شرحیں ہوئیں، دنیا کی کسی اور زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مولانا کے عرفانی کمالات اس علاقے کے لوگوں کے لیے جواں مردی اور اخلاقی شہسواری کے لیے مثال بنے اور انہوں نے تین لحاظ سے اس خطے کے لوگوں کو متاثر کیا:

1- زندگی، اخلاق اور تصوف میں مخصوص طرز۔
2- افکار مولانا جو فطرت انسانی کے نمائندہ ہیں۔
3- مثنوی شریف۔

مولانا صلاح الدین احمد

مولانا رومی کے یہاں چہرۂ محبوب ماہ نہیں، مہر ہے، چاند نہیں بلکہ سورج ہے۔ اور اس تصور میں

Marfat.com

زندگی کی وہ تمام کیفیات حرارت و وحدت موجود ہیں جو آفتاب سے خاص ہیں۔ دوسرا یہ کہ انسان ذاتِ باری سے وہی نسبت تعلق رکھتا ہے جو ذرّے کو آفتاب کے ساتھ ہے۔ اور تیسرا یہ کہ عشق براہ راست اس سرچشمۂ نور و حرارت سے مستیز ہے جس نے خود آفتاب کو بخشی اور اسے زندگی کا خالق و رہنما بنایا۔ اور چوتھا یہ کہ رومی کے یہاں ذات، موت کی اور روز روشن صحیح طور پر زندگی کی علامت اور اس کے ہم معنی ہے۔

ڈاکٹر محمد اکرم

عام صوفیا نے فنا اور ترک دنیا پر زور دینا تعلیم کا مقصود بنالیا تھا۔ مولانا روم نے اس کو بقا اور ارتقا کے نظریے سے بدل دیا۔ رومی کے ہاں خودی کا استحکام لازمی ہے۔ ان کا طریقہ قوتِ تسخیر میں اضافہ کرتا ہے۔ عجمی تصوف نے ترک حاجات کو خدا رسی قرار دیا تھا۔ رومی کہتے ہیں کہ حاجت تو مصدر وجود اور منبع بہبود ہے۔ خدا کی خوبی ہے کہ بے نیاز ہے۔ بندے کی بندگی حاجات طلبی سے وابستہ ہے۔ لیکن رومی اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ حاجات پست اور حیات کُش نہ ہوں۔ زندگی کے تقاضے بلند ہونے چاہئیں۔ رومی اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ خدا نے زمین و آسمان عبث نہیں پیدا کئے بلکہ کسی حاجت ہی سے کیے ہیں۔

وِن فیلڈ

مثنوی نظری تصوف کا کوئی رسالہ نہیں بلکہ عملی تصوف کی ایک تفسیر ہے۔ چنانچہ رومی اس ساری صوفیانہ روحانیت کی نمائش اس منطقی صحت کے ساتھ نہیں کرتے جس طرح کوئی باضابطہ مفکر کرتا ہے بلکہ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ قارئین یہ سب کچھ خوب جانتے ہیں۔

آر۔ اے۔ نکلسن

فارسی کے شعری ادب میں اعلیٰ درجے کے صوفیانہ مضامین کا اظہار رومی کے توسط سے بروئے کار آیا۔ صوفیانہ شاعری کے وسیع تناظر میں رومی ایک پُر وقار پہاڑی قلعہ کی طرح ایستادہ نظر آتے ہیں جبکہ ان سے قبل کے اور بعد کے دوسرے متعدد شعراء ان کے مقابلے میں دامنِ کوہ کے مکین دکھائی دیتے

ہیں۔رومی کی قائم کردہ مثال حد درجہ جاذبِ توجہ ثابت ہوئی ہے۔ان کی فکر اور زبان کا اثر ان کے بعد کی آنے والی صدیوں میں شدت سے محسوس کیا گیا۔ پھر تو ہر صوفی جو فارسی زبان سے واقف تھا، ان کی عظمت کو تسلیم کرنے لگا۔

ای۔جی۔براؤن

جلال الدین رومی خاکِ ایران سے اٹھنے والے بلاشبہ ممتاز ترین صوفی شاعر ہیں۔ان کی صوفیانہ ''مثنوی'' دوامی حیثیت کی عظیم نظموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔

اے۔جی۔آربری

عظمتِ رومی کے سلسلے میں بے شمار کلمہ ہائے تحسین پیش کیے گئے ہیں۔ان کی عظمت کا اعتراف مغرب میں بھی اسی قدر کیا گیا ہے جس قدر مشرق میں! رومی نے انسانیت کو اپنے رفیع المرتبت اور عظیم الشان سرمایۂ ادب وفکر سے مالا مال کر دیا تھا۔

جوناتھن سٹار

صوفیانہ ادب میں رومی کی شاعرانہ اور روحانی خدمات قابل یادگار ہیں۔انہوں نے اپنی وسیع تخلیقات کے ذریعے نہ صرف اسلامی تصوف کو بہ حسن وخوبی اجاگر کیا ہے بلکہ اسے نکھارا اور سنوارا ہے اور سرور انگیز حسن کی صورت عطا کی ہے۔انہوں نے جو ذاتی تجربات پیش کیے ہیں وہ آفاقی صداقت کے آئینہ دار ہیں.....یعنی عام انسان کی زندگی جو ہمہ گیر بھی ہے، مصروف کار بھی ہے اور نا قابل یقین حوادث سے پُر بھی ہے۔رومی کی نظر میں یہ سب کچھ ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی کے سفر کے نہایت ضروری لوازمات ہیں۔ پھر، رومی نے ہر ہر لفظ کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔جو کوئی ان کے اشعار کا مطالعہ کرتا ہے وہ روح کے عریاں ہیئت کا نظارہ کر لیتا ہے جو حیات کے لباس میں ملفوف ہے۔

ہم رومی کے کلام میں عشق ومحبت کی سچی آواز کی گونج سنتے ہیں۔ہم اس میں عاشق ومعشوق کے درمیان ہونے والی سرگوشی کو سن لیتے ہیں۔ہم اس مسرور دل کو بخوبی محسوس کر لیتے ہیں جو اپنے ہی

Marfat.com

وجود کے پگھلتے ہوئے مادے پر رواں دواں ہے۔

کول مین بارک

رومی کی یہ نظمیں مغرب کے وضع کردہ یادگاری لمحات کی مانند نہیں۔ نہ ہی یہ جدا جدا رنگ و آہنگ پر مبنی عناصر کا مرکز ہے..... بلکہ یہ تو ایک سیّال شئے ہے جو مسلسل اپنی ہیئت تبدیل کرتا رہتا ہے، جو اپنے وجود کی خبر دیتا رہتا ہے۔

آپ اسے روشن خیالی کا نام دے سکتے ہیں، محبت کی سرشاری قرار دے سکے ہیں، اسے روح، صداقت اور علم کا سمندر قرار دے سکتے ہیں یا پھر اَلَسْتُ..... کا مظہر تجویز کر سکتے ہیں۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ ہر ذی نفس میں ایک سمندر موجزن ہے۔ رومی کی شاعری اسی سمندر کے اندر سے آتی ہوئی نمکین ہوا ہے جو خشکی کی جانب سفر کر رہی ہے۔

ہارپر سین

ہم جو موجودہ دور کے تھکے تھکے سے لوگ ہیں، صرف رومی سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ رومی نے جس کسی سے خود محبت کی ہے، اس سے بھی محبت کرنے لگتے ہیں۔

جیک کورن فیلڈ

رومی دنیا کے عظیم صوفی شاعر ہیں۔ ان کے اشعار سے سنہری شعاعیں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

ہسٹن اسمتھ

آج امریکہ میں رومی سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں۔

○○○

زیر نظر باب کے آخر میں راقم الحروف خود مولانا جلال الدین رومی کے فرزند اکبر سلطان ولد کی مثنوی ''ولد نامہ'' کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہ رہا ہے۔ مذکورہ بالا قلمکاروں نے مولانائے روم کی

Marfat.com

شاعری اور فکری زاویے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں، لیکن سلطان ولد نے اُس دور کی سچی تصویر پیش کی ہے، جب شمس تبریز سے ملاقات کے بعد ان کی زندگی کا ایک نیا رنگ سامنے آیا تھا۔ رقص وسماع ان کا لازمۂ حیات بن چکا تھا۔ مولانا نے پیشۂ معلّمی کو ترک کر دیا تھا۔ مسند استفتا پر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ شاہانہ کروفر نابود ہو گیا تھا۔ مولانا کے اس دور کی تصویر جس انداز میں ان کے صاحبزادے نے پیش کی ہے، اس کی اہمیت سوانحِ روم میں ہمیشہ برقرار رہے گی کہ یہی دراصل ان کی زندگی کا وہ رُخ ہے جس نے انہیں ابدیت عطا کر دی ہے۔ سلطان ولد رقمطراز ہیں:

روز و شب در سماع رقصان شُد　　برزمین ہمچو چرخ گردان شد
بانگ و فُغانِ او بعرش رسید　　نالہ اش را بزرگ و خورد شنید
سیم و زر را بہ مطربان میداد　　ہر چہ بودش بہ خادمان میداد
یک زمان بے سماع و رقص نبود　　روز و شب لحظۂ نمی آسود
غلغلۂ او فتاد اندر شہر　　شہر چہ، در زمانہ و دہر
کاین چنین قطب و مفتیٔ اسلام　　کوست اندر دو کون شیخ و امام
شورہا می کند چو شیدا او　　گاہ پنہان و گاہ ہویدا او
خلق ازوے ز شرع و دین گشتند　　ہمہ گان عشق را رہین گشتند
حافظان جملہ شعر خوان شدہ اند　　بسوئے مطربان روان شدہ اند

(میرے والد وجد میں شب و روز رقص کناں رہتے۔ زمین پر اس طرح متحرک رہتے جیسے آسمان گردش میں ہو۔ ان کی آوازِ فغاں فلک تک پہنچتی تھی۔ ان کا نالہ ہر کہہ ومہ سنتا تھا۔ گانے والوں پر وہ سیم وزر کی بارش کرتے اور اپنے خادموں کو ہر وہ چیز عنایت کر دیتے جو ان کی تحویل میں ہوتی۔ وہ رقص وسماع کے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں رہ پاتے۔ دن رات میں کسی وقت بھی وہ آرام نہیں کر پاتے تھے۔

شہر میں غوغا پھیلنے لگا۔ شہر ہی نہیں سارا زمانہ اور سارا عالم انقلاب انگیز بن گیا تھا۔ آخر کس طرح وقت کا عظیم قطب، مفتی، شیخ اور امام جنونی کیفیت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ لوگ جو شرع اور دین کے داعی اور مبلغ تھے، اب وہ رقص وسرود کے شیدا نظر آ رہے ہیں۔ ہر شخص

Marfat.com

موسیقاروں کی طرف راغب دکھائی دے رہا ہے اور عشق کی جانب دیوانہ وار مائل ہوتا جا رہا ہے۔)

قارئین! مولانائے روم کی زندگی کا یہ ایک ٹرننگ پوآئنٹ (Turning Point) تھا۔ اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو ہم کیا، پوری دنیا، پورا فارسی ادب، تمام عالمی ادب اُس ''رومی'' سے قطعاً نا آشنا ہوتا جس کے جلیل القدر شعری کارناموں سے دنیا بھر کا ایوانِ ادب گونج رہا ہے اور یقین واثق ہے، قیامت تک گونجتا رہے گا کہ اس تحریک کے پس پردہ دو صوفیٔ وقت کی ''گرمیٔ عشق'' تندور کا کام دے رہی تھی..... ایک شمس تبریز اور دوسرے ان کے مُرشد بابا کمال الدین جندی جنہوں نے اول الذکر کو یہ حکم دیا تھا:

''روم جاؤ۔ وہاں ایک دل سوختہ ہے، اس کو گرم کر آؤ۔''

یہ دیوانِ جامع اور مثنویٔ معنوی اسی تندور کی گرمیٔ عشق کا ثمرۂ دلفریب واثر آفریں ہے۔

Marfat.com

انتخابِ کلامِ رومیؒ[1]

- دیوانِ شمس تبریز
- مثنویٔ معنوی

1۔ راقم الحروف نے غزلیاتِ رومی کا ترجمہ سیدھے سادے انداز میں کیا ہے۔ البتہ مثنوی کا منظوم ترجمہ مولانا ہی کی بحر میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ (م۔ر)

Marfat.com

○

بروید ای حریفان بکشید یار ما را
بمن آورید حالا، صنمِ گریز پا را
اگر او بہ وعدہ گوید کہ دم دگر بیا ید
مخورید مکر او را بفریہد او شما را
نہ بہانہ ہائے شیرین، بہ ترانہ ہائے موزون
بکشید کوئے خانہ مہ خوب خوش لقا را[1]

Marfat.com

1 یہ غزل مولانائے روم کی اُن ابتدائی غزلوں میں ہے جو فراقِ شمس تبریز میں لکھی گئی تھیں۔ ہم اُسے بلا چون و چرا مولویٔ معنوی کی شاعری کا ''ابتدائیہ'' قرار دے سکتے ہیں۔ ان اشعار کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آگے چل کر ہم جس عظیم المرتبت شاعر کے کلام بلاغت نظام کا مطالعہ کرنے والے ہیں، اس کا Prologue کس غضب کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، حُسن و عشق کی سرمستی ہر مصرعے سے ہویدا ہو رہی ہے۔ وہ رومی جو جبہ و دستار سے مکلّف تھے، دیدارِ تبریز کے بعد جس عالمِ وارفتگی سے دوچار ہوئے اس کا یہ آغاز جمیل ہے۔

اے دوستو، اے چارہ گرو جاؤ
اور مرے یار کو بس کھینچ ہی لاؤ
ہے میرا صنم، یار مرا مجھ سے گریزاں
ہو جس طرح بھی، تم اسے لاؤ تو یہاں
اگر کرے یہ وعدہ آؤں گا بعد میں مَیں
اور اپنی صورت دکھاؤں گا بعد میں مَیں
تو تم یہ سمجھنا وہ فریب دے رہا ہے
اور حیلہ بازی سے کام لے رہا ہے
جاؤ اور میٹھے گیت گا کر
نغمے حسیں سُنا کر
بہانہ رنگیں بنا کر
میرے چاند سے صنم کو
میرے گھر کھینچ لاؤ
(میں اس کا منتظر ہوں!)

Marfat.com

○

معشوقہ بہ سامان شد، تا باد چنین بادا
کفرش ہمہ ایمان شد، تاباد چنین بادا

ملکی کہ پریشان شد، از شومی شیطان شد
بازآن سلیمان شد، تا باد چنین بادا

یاری کہ دلم خستی، دربر رخ ما بستی
غمخوارۂ یاران شد، تا باد چنین بادا

ھم بادہ جدا خوردی، ھم عیش جدا کردی
نک سردہ مھمان شد، تاباد چنین بادا

زان خشم در و غنیش، زان شیوۂ شیرینش
عالم شکرستان شد، تاباد چنین بادا

از دولت محزونان، و زھمت مجنونان
آں سلسلہ جنبان شد، تاباد چنین بادا

عید آمد و عید آمد، یاری کہ رمید آمد
عیدانہ فراوان شد تا باد چنین بادا

بر روح برافزودی، تابود چنین بودی
فَرَّ تو فروزان شد، تاباد چنین بادا

غم رفت وفتوح آمد، شب رفت وصبوح آمد
خورشید درخشان شد، تاباد چنین بادا

Marfat.com

معشوقہ پورے جوبن پر ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے،
کفر سراسر ایماں میں منتقل ہو گیا ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
اگر ملک میں پریشانی کا عالم تھا، تو یہ شیطان کی کارستانی تھی،
لیکن اب حضرت سلیمانؑ کا زمانہ آ گیا ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
کہاں میرا یار میرے دل پر جور و ستم کرتا تھا اور اپنا جلوہ نہیں دکھاتا تھا،
اب دوست کی غم خواری میسر ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
ہم اکیلے ہی مے نوشی کرتے اور اس سے لذت اٹھاتے تھے،
لیکن آج میرا یار مہمان ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
تُو نے جو خفگی دکھائی وہ جھوٹی تھی، اور اب تیرا شیوہ خوش آئند ہے،
یہ شکر کا مقام ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
غم زدہ لوگوں کی بدولت اور جنونی افراد کی ہمت کے باعث،
وہ سلسلہ جنباں ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
عید آ گئی ہے اور جو دوست بچھڑ گیا تھا وہ بھی آیا ہے،
غرض عیدی کی فراوانی ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔
تو روح کے اندر پوشیدہ تھا، اور ایسا ہونا بھی تھا،
اور اب نور فروزاں ہو چکا ہے، کاش یہ صورت یونہی قائم رہے۔
غم رخصت ہو چکا ہے اور خوشی کی گھڑی آ گئی ہے، رات تمام ہوئی اور صبح ہو گئی،
اور سورج چمکنے لگا ہے، کاش یہ صورت یوں ہی قائم رہے۔

Marfat.com

○

کناری ندارد بیابان ما

قراری ندارد دل و جانِ ما

جهان در جهان نقش صورت گرفت

کدا مست ازین نقش ها آن ما

چو در ره ببینی بُریده سری

که غلطان رود سوی میدانِ ما

ازو پرس ازو پرس اسرارِ دل

کزو بشنوی سرِّ پنهانِ ما

چه بودی که یک گوش پیدا شدی

حریف زبان هائے مرغان ما

چه بودی که یک مرغ پرّاں شدی

برو طوقِ سرّ سلیمانِ ما

چه گوئیم چه دانم که این داستان

فزونست از حد و امکانِ ما

چه کهکان چه بازان بهم می پرند

میان هوای کهستانِ ما

Marfat.com

ہمارا بیاباں بے حدو بے کنار ہے،
ہماری روح اور دل کو قرار حاصل نہیں!
ہر طرف صورتوں کے نقوش نمایاں ہیں،
ان میں ہمارا کون سا نقش ہے؟
جب تم راستے میں ایک بریدہ سر دیکھو،
جو ہمارے میدان کی جانب لڑھکتا چلا آ رہا ہے،
تو اس سے دل کے اسرار معلوم کرو،
تا کہ تمہیں اس سے ہمارا بھید معلوم ہو جائے گا۔
یہ کیوں کر ہوا گر ایک گوش ہمہ تن متوجہ ہو کر،
چہچہانے والے پرندوں کی آواز سے آشنا ہو جائے۔
یہ کیوں کر ہوا گر ایک پرند بازو پھیلائے اڑے،
اور وہ ہمارے سلیمان کے پر اسرار طوق سے مزین ہو۔
اس داستان کے بارے میں میں کیا کہوں اور کیا سمجھوں،
یہ ہمارے حد و امکاں سے بھی پرے ہے۔
کبک اور باز باہم مل کر اُڑ رہے ہیں،
ہمارے کوہستان کے درمیان!

Marfat.com

○

ای یارما، دلدار ما، ای عالم اسرار ما

ای یوسف دیدار ما، اے رونق بازار ما

نکبر دم امسال ما، خوش عاشق آمد یار ما

ما مفلسا نیم وتوی صد گنج وصد دینار ما

ما خستگانیم و توی صد مرهم بیمار ما

ما بس خرابیم وتوی هم از کرم معمار ما

من دوش گفتم عشق را ای خسرو عیار ما

سردر مکش، منکر مشو، تو برده ای دستار ما

واپس جوابم داداو، نی از توست این کار ما

چوں ہر چہ گوي وادھد ھمچون صدا کہسار ما

Marfat.com

اے مرے یار، تو دل دار ہے اور عالم اسرار ہے،
تو ہی یوسفِ دیدار ہے اور تو ہی ہمارے بازار کی رونق ہے۔
اس سال ایسی ساعت آئی کہ تجھ سا محبوب آیا،
ہم مفلس اور گدا ہیں اور تو ہی ہمارے لیے سینکڑوں
خزانے اور دینار کی مانند ہے۔
ہم تھک کر چُور ہیں اور تو ہی ہم جیسے خستہ و بیمار کے لیے مرہم ہے،
ہم ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں اور تو ہی ہمارا مہرباں معمار ہے۔
ہم نے عشق سے کہا کہ اے خسرو عیار ذرا سُن،
اپنا منہ مت چھپا، منکر نہ بن کہ تو نے ہماری دستار چوری کی ہے۔
اس نے یہ سن کر جواب دیا، یہ کام ہمارا نہیں تیرا ہے،
تو جو کچھ کہتا ہے وہی ہمارے پہاڑ سے ٹکرا کر گونجتا ہے۔

Marfat.com

○

یار مرا، غار مرا، عشقِ جگر خوار مرا

یار توئی، غار توئی، خواجہ نگہدار مرا

نوح توئی، روح توئی، فاتح و مفتوح توئی

سینۂ مشروح توئی، بر در اسرار مرا

نور توئی، سور توئی، دولت منصور توئی

مرغ کہنہ طور توئی، خستہ بمنقار مرا

قطرہ توئی، بحر توئی، لطف توئی، قہر توئی

قند توئی، زہر توئی، بیش میازار مرا

حجرۂ خورشید توئی، خانۂ ناہید توئی

روضۂ اومید توئی، راہ دہ ای یار مرا

روز توئی، روزہ توئی، حاصل دریوزہ توئی

آب توئی، کوزہ توئی، آب دہ ای یار مرا

دانہ توئی، دام توئی، بادہ توئی، جام توئی

پختہ توئی، خام توئی، خام بمگذار مرا

Marfat.com

تم ہی مرے دوست، رفیق، یار غار ہو

تم ہی قابل بھروسہ ہو، تم ہی رہبر و رہنما ہو

تم نوح بھی ہو، روح بھی ہو، فاتح و مفتوح بھی ہو

تم ہی اسرار و رموز کے پیکر ہو

تم ہی روشنی بھی ہو اور اظہار بھی

قطرہ بھی تم ہی ہو، سمندر بھی تم

لطف بھی تم اور قہر بھی تم، فتنہ بھی اور رند بھی تم

تم حجرۂ خورشید بھی اور خانۂ ناہید بھی

تم ہی جملہ صورتوں میں امید کے محور بھی ہو

تم ہی مایوس کُن حالات میں نجات دہندہ ہو

آب بھی ہو، کوزہ بھی، دانہ و دوام بھی ہو

تم ہی بادہ و جام بھی ہو، تم ہی پختہ و خام بھی ہو!

○

دوشِ من پیغام کردم سوی تو استاره را
گفتمش خدمت رسان ازمن توآن مه پاره را

سجده کردم گفتم آن خدمت بدان خورشید بر
کو بتابش زرکند مر سنگ هائے خاره را

سینهٔ خود باز کردم زخم ها بنمود مش
گفتمش از من خبرکن دلبر خون خواره را

سو به سو گشتم که تا طفل دلم خامش شود
طفل خسپد چون بجنباند کسی گهواره را

طفل دل را شِیرده مارا زگریه اش وارهان
ای تو چاره کرده هر دم صد چومن بیچاره را

شهر وصلت بوده است آخر ز اول جای دل
چند داری در غریبی این دلِ آواره را

من خمش کر دم و لیکن ازپئ دفع خمار
ساقیا سرمست گردان نرگس خماره را

کل میں نے ایک ستارے کو تیرے لیے یہ پیغام دیا،
اُس چاند کی طرح چمکنے والے محبوب کو میری خبر پہنچا۔
میں نے سجدہ ریز ہو کر یہ التجا کی کہ اسے سورج تک پہنچا دے،
جس کی تپش سے سنگ خارہ زر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
میں نے پھر اپنا سینہ کھول دیا اور اسے سارے زخم دکھائے،
اور یہ کہا کہ اس محبوب کو جو خونِ دل پیتا ہے، میرا حال بتانا۔
میں اِدھر اُدھر گردش میں رہتا ہوں تا کہ میرا طفلِ دل چپ ہو جائے،
ایسا اس لیے کرتا ہوں کہ جب پنگورہ گردش میں ہو تو بچہ سو جاتا ہے۔
میرے طفلِ دل کو دودھ پلا اور مجھے گردش سے نجات دے،
تُو ہی تو ہے جو ہر لمحہ مجھ جیسے سینکڑوں درماندہ کی مدد کرتا ہے۔
شہر دل اول تا آخر جائے وصل ہی تو ہے،
آخر تو اس آوارہ دل کو کب تک نظر انداز کرتا رہے گا۔
میں خاموش تو ہو گیا ہوں، لیکن اے میرے ساقی،
سر کے خمار کو توڑنے کے لیے آنکھوں کو خمار آلود کر دے۔

Marfat.com

○

هر نفس آوازِ عشق می رسد از چپ وراست

مابہ فلک میر و یم عزم تماشا کر است

ما بفلک بوده ایم یار ملک بوده ایم

باز ہمان جا رویم خواجہ کہ آن شہر ماست

خود ز فلک بر تریم و ز ملک افزون تریم

زین دو چرا نگذریم منزل ما کبریاست

عالم خاک از کجا گوہر پاک از کجا

گرچہ فرود آمدیم باز دویم این چہ جاست

بخت جوان یار ما دادن جان کارما

قافلہ سالار ما فخر جہان مصطفیٰؐ ست

Marfat.com

آوازِ عشق ہر ہر لمحہ دائیں اور بائیں سے آ رہی ہے،

ہم سوئے فلک رواں ہیں اور کس میں یہ منظر دیکھنے کا حوصلہ ہے۔

ہم آسمانوں میں رہے ہیں اور فرشتے ہمارے دوست تھے،

لہٰذا ہمیں اب وہاں لوٹ جانا چاہیے کہ وہ اپنا ہی وطن ہے۔

ہم فلک سے بھی اعلیٰ ترین ہیں اور ملک سے افزوں تر ہیں،

پھر ہم ان دونوں سے کیوں آگے نہ بڑھیں کہ ہماری منزل تو ذاتِ کبریا ہے۔

کہاں یہ عالمِ خاک اور کہاں وہ گوہرِ پاک،

گرچہ ہم نچلی سطح تک آ گئے لیکن اس ادنیٰ مقام سے جلد واپس چلنا چاہیے۔

بختِ جواں ہمارا دوست ہے اور تسلیم جاں ہمارا پیشہ ہے،

اور ہمارے کارواں کے رہنما حضرت مصطفیٰؐ ہیں جو رونقِ جہاں ہیں۔

Marfat.com

○

آن روح را کہ عشقِ حقیقی شعار نیست
نابودہ بہ کہ بودن او غیر عار نیست
در عشق مست باش کہ عشق ہست ہرچہ ہست
بے کار و بارِ عشق بر یار بار نیست
عشق است و عاشق است کہ باقیست تا ابد
دل جز برین منہ کہ بجز مستعار نیست
تا کی کنارِ گیری معشوق مردہ را
جان را کنار گیر کہ او را کنار نیست
نظارہ گر مباش درین راہِ منتظر
واللہ کہ ہیچ مرگ بتر ز انتظار نیست

Marfat.com

یہ کہیں بہتر تھا کہ وہ روح جو محبت کا سچا و صادق
لبادہ نہیں اوڑھتی، عالم وجود میں نہ آتی۔
ایسی روح کا وجود سراسر شرم و عار کی حیثیت کا حامل ہے۔
عشق کی شراب پی کر مدہوش ہو جاؤ،
اس لئے کہ یہ عشق ہی تو ہے جو قائم و دائم ہے۔
جب تک عشق میں کامل نہ ہو گے، اس وقت تک محبوب کی رسائی ناممکن ہے۔
یہ عشق اور یہ عاشق ہے جو تا ابد باقی رہے گا،
لہٰذا اپنے دل کو کسی اور سمت نہ لگانا کہ یہ سراسر مستعار ہے۔
تم کب تک ایک مردہ معشوق کے جسم کو بغل گیر کرتے رہو گے،
لہٰذا روح سے ہمکنار ہو کہ اسے کسی چیز نے اپنی گرفت میں نہیں لیا ہے۔
عشق و محبت کی راہ میں متلاشی نظارہ گر نہ بنو،
کہ بخدا توقع سے بڑھ کر کوئی شئے یہاں بدتر از موت نہیں!

○

بگیر دامن لطفش که ناگهان بگریزد
ولی مکش تو چو تیرش که از کمان بگریزد

چه نقشها که ببازد چه حیلها که بسازد
بنقشِ حاضر باشد ز راه جان بگریزد

در آزمانش بجوئی چو مہ در آب بتابد
در آب چونکه در آئی بآسمان بگریزد

ز لامکانش بجوئی نیشان دہد بمکانت
چو در مکانش بجوئی بلا مکان بگریزد

چو تیر می برود از کمان چو مرغ گمانت
یقیں بدان که یقین وار از گمان بگریزد

از این وآن بگریزم ز ترس نی ز ملولی
که آن نگار لطیفم ز این و آن بگریزد

گریز پائی چو بادم ز عشق گل چو صبا ام
گلی ز بیم خزانی ز بوستان بگریزد

چنان گریزد از تو که گر نویسی نقشش
ز لوح نقش بپرّد و ز دل نشان بگریزد

Marfat.com

اس کے دامنِ لطف کو پکڑو، وگرنہ وہ اچانک بھاگ جائے گا،

لیکن تیر کی مانند اسے نہ کھینچو وگرنہ وہ کمان سے نکل بھاگے گا!

وہ کیسی کیسی صورت گری اختیار کرتا ہے اور کیسی کیسی چالبازی دکھاتا ہے،

اگر وہ شکل وصورت میں جلوہ گر ہے تو روح کے راستے نکل بھاگے گا!

اسے فلک پر تلاش کرو، وہ سطح آب پر چمکتا ہے، ٹھیک ماہ ہی طرح،

اور جب تم اسے پکڑنے پانی میں اترو گے تو وہ آسمان کی جانب بھاگ جائے گا!

اسے لامکاں میں تلاش کرو گے تو وہ مکانیت کی جانب اشارہ کرے گا،

اور جب مکاں میں ڈھونڈو گے تو وہ لامکاں کی طرف بھاگ جائے گا!

جس طرح تیر تیزی سے کمان سے نکلتا ہے، جس طرح تمہارا مرغ گمان اُڑتا ہے،

تو جان لو کہ وہ پیکر یقین حد گماں سے بھی بھاگ جائے گا!

وہ ایں وآں سے بھاگ نکلے گا، لیکن درماندگی سے نہیں بلکہ خوف سے،

اسی طرح میرا نگارِ لطف ایں وآں سے فرار ہو جائے گا!

جس طرح میں نسیم کی طرح گریزپا ہوں اور صبا کی طرح عاشقِ گل ہوں،

اسی طرح گلاب کا پھول شدید خزاں میں صحن گلشن سے روپوش ہو جائے گا!

وہ تمہارے وجود سے فرار ہو جائے گا اور اگر تم اس کی تصویر گری کرو گے،

تو تصویر لوح سے نکل جائیگی اور اس کا تاثر دل سے محو ہو جائے گا!

○

مرغ و ماہی زمن شدہ حیران
کاین شب و روز چون نمی خپد
پیش ازین در عجب ھمی بودم
کا سمان نگون نمی خپد
آسمان خود کنون زمن خیرہ است
کہ چرا این زبون نمی خپد
عشق برمن فسونِ اعظم خواند
دل شنید آن فسون نمی خپد

Marfat.com

میرے شب و روز جاگتے رہنے پر مرغ و ماہی حیران و ششدر ہیں۔
جب میری ایسی حالت نہیں ہوئی تھی تو میں خود
خمیدہ آسمان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتا تھا کہ یہ سوتا کیوں نہیں ہے۔
لیکن اب آسمان خود میری زبوں حالی پر حیران ہو رہا ہے۔
عشق کے جذبے نے مجھ پر ایک سحر طاری کر دیا ہے۔
اور اسی فسوں کا اثر ہے کہ میرا دل لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوتا!

Marfat.com

○

صورتگر نقاشم هرلحظه بُتی سازم

وانگه همه بتهارا درپیش تو بگدازم

صد نقش بر انگیزم باروح در آمیزم

چوں نقش ترا بینم در آتشش اندازم

تو ساقیٔ خماری یا دشمن هشیاری

یا آنکه کنی ویران هر خانه که بر سازم

جان ریخته شد باتو آمیخته شد باتو

چوں بوی تو دارد جان جانراهله بنوازم

هر خون که زمن روید باخاک تو میگوید

بامهر تو همرنگم باعشق تو انبازم

درخانهٔ آب وگلِ بی تست خراب این دل

یاخانه در آ ای جان یا خاتمه پردازم

Marfat.com

میں نقاش ہوں، ہر لمحہ تصویریں بناتا ہوں اور حسن آفریں صورت گری کرتا ہوں،
لیکن تمہاری موجودگی میں ان سب کو پگھلا کر رکھ دیتا ہوں۔
میں سو نقش بناتا ہوں اور ان میں جان ڈال دیتا ہوں،
لیکن جب میں تمہارا نقش دیکھتا ہوں، ان سب کو جلا ڈالتا ہوں۔
کیا تم مدہوش کر دینے والے ساقی ہو یا ہوشیار افراد کے دشمن ہو،
کیا تم وہ شخص ہو کہ میں جب بھی کوئی گھر بناتا ہوں، تم مسمار کر دیتے ہو؟
تم میں میری روح محلول کر گئی ہے اور تمہاری ذات میں مدغم ہو گئی ہے،
لو سنو، میں اپنی روح کو عزیز رکھوں گا اس لیے کہ یہ تمہاری خوشبو میں رچی بسی ہے۔
میرے جسم سے بہتا ہوا ہر خون خاک سے یوں کہہ رہا ہے،
میں تمہاری ہی محبت کا ایک رنگ ہوں، میں تمہارے ہی لطف کا ایک حصہ ہوں۔
اس خانۂ آب و گل میں یہ دل تمہارے بغیر خراب و خستہ ہے،
اے میری جان، یا تم اس میں در آؤ یا پھر میں اسے چھوڑ دوں گا!

○

چہ تدبیر اے مسلمانان کہ من خود را نمی دانم
نہ ترسا نہ یہودم من نہ گبرم نہ مسلمانم
نہ شرقیم نہ غربیم نہ بریم نہ بحریم
نہ ازکان طبیعیم، نہ از افلاک گردانم
نہ از ہندم نہ ازچینم نہ از بلغار و سقینم
نہ از ملکِ عراقینم، نہ از خاکِ خراسانم
مکانم لامکاں باشد، نشانم بے نشان باشد
نہ تن باشد نہ جان باشد کہ من از جانِ جانانم
دوئی ازخود بدر کردم یکے دیدم در عالم را
یکے جویم یکے دانم یکے بینم یکے خوانم

Marfat.com

اے مسلمانو! کیا تدبیر کی جائے کہ میں خود سے واقف نہیں ہوں،
نہ میں عیسائی ہوں، نہ یہودی، نہ گبر ہوں اور نہ مسلمان!
نہ میں مشرقی ہوں نہ مغربی، نہ میں خشکی سے تعلق رکھتا ہوں اور نہ سمندر سے،
نہ میرا تعلق فطرت کی کان سے ہے اور نہ ہی مخروطی فلک سے!

نہ میں ہندوستانی ہوں نہ چینی، نہ بلغاریہ کا ہوں نہ سقین کا،
نہ ہی میں عراقی سلطنت سے تعلق رکھتا ہوں، نہ ہی خراسانی ہوں!

لامکاں ہی میرا مکاں ہے اور بے نشانی ہی میرا نشان ہے،
نہ میرا کوئی جسم ہے نہ جان، میں تو بس اپنے محبوب کے وجود سے تعلق رکھتا ہوں!

میں نے دوئی کو الگ تھلگ کر دیا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ دونوں عالم ایک ہیں،
بس، میں تو ایک ہی کو ڈھونڈتا ہوں، میں ایک ہی کو جانتا ہوں، میں ایک ہی کو دیکھتا
ہوں اور ایک ہی کو پکارتا ہوں!

○

شنیده ام که عزم سفر میکنی مکن
مهر حریف و یار دگر میکنی مکن
تو در جهانِ غریبی و غربت ندیده
قصد کدام خسته جگر میکنی مکن
ای مهه که چرخ زیر و زبر از برای تست
مارا خراب و زیر و زبر میکنی مکن
کو عهد و کو وثیقه که با ما تو کرده
از قول و عهد خویش عبر میکنی مکن
ای برتر از وجود و عدم پایگاه تو
این لحظه از وجود گزر میکنی مکن
ای دوزخ و بهشت غلامانِ امر تو
برمن بهشت همچو سقر میکنی مکن
جانم چو کورهٔ پر آتش بستِ نکرد
روی من از فراق چو زر میکنی مکن
چون روی در کشی تو شودمه زغم سیه
قصد کسوف قرص قمر میکنی مکن
ما خشک لب شویم چو تو خشک آوری
چشم مرا باشک چه تر میکنی مکن

میں نے سنا ہے کہ تم عزم سفر کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو،

اور اب تم کسی نئے دوست کے ساتھ محبت کی پینگ بڑھانے والے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

تم اس جہاں میں بالکل اجنبی ہو اور تم نے اجنبیت کبھی دیکھی نہیں،

اے خستہ جگر، تم کس جگہ جانے کا قصد کرنے والے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

اے میرے چاند! یہ آسمان تمہارے لیے ہی زیروزبر ہو رہا ہے،

اور اب تم خود مجھے زیروزبر کرنا چاہ رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

کہاں گئے وہ وعدے اور عہد و پیمان جو تم نے مجھ سے کیے تھے؟

اب تم اپنے ہی وعدے وعید سے پھر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

تمہاری دہلیز تو وجود و عدم کے امکان سے ماورا ہے،

اور اب تم اپنی ہی زندگی سے ہاتھ دھونے جا رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

تم تو وہ ہو کہ دوزخ و بہشت تمہارے زیر فرمان ہیں،

لیکن تم فردوس کو میرے لیے دہکتی دوزخ بنا رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

میرا وجود ایک دہکتی آگ ہے، لیکن تم اس پر بھی خوش نہیں،

اور اب مجھے اپنے فراق کے صدمے سے زرد رُو کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

جب تم اپنے وجود کو چھپاتے ہو تو چاند مارے غم کے سیاہ ہو جاتا ہے،

تم کیوں چاند کو گہنانے پر تُلے ہوئے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

جب تم خشک روئی پر اتر آتے ہو تو میرے لب خشک ہو جاتے ہیں،

تم آخر میری آنکھوں کو اشک آلود کیوں کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔

Marfat.com

○

فقر را در خواب دیدم دوشِ من
گشتم از خوبی او بیهوش من
از جمال و از کمالِ لطف فقر
تا سحر گهہ بوده ام مدهوش من
فقر را دیدم مثالِ کان لعل
تا ز رنگش گشتم اطلس پوش من
بس شنیدم های و هوی عاشقان
بس شنیدم بانگِ نوشا نوش من
حلقه ای دیدم همه سر مست فقر
حلقهٔ او دیدم اندر گوش من
بس بدیدم نقشها در نور فقر
بس بدیدم نقش جان در روش من
از میان جانِ ما صد جوش خاست
چون بدیدم بحر را در جوش من
صد هزاران نعره می زد آسمان
ای غلام همچناں چاوش من

Marfat.com

میں نے کل رات خواب میں ایک عارف کو دیکھا،
اس کی خوبی ہی کو دیکھ کر میں بے ہوش ہو گیا۔
اس کے جمال اور کمال کا ہی یہ اثر تھا کہ
میں سحر ہونے تک مدہوش رہا۔
میں نے عارف کو سرخ ہیروں کی کان کی مانند پایا،
میں اس کے رنگ اور دمک سے ثروت مند بن گیا۔
میں نے عاشقوں کا بے طرح شور و غوغا سنا،
میں نے گھونٹ پر گھونٹ پیتے چلے جانے کی آواز سنی۔
میں نے ایک ایسی مجلس دیکھی جس میں سبھی عارف کے دیوانے تھے،
اور میں نے اپنے آپ کو اس کا حلقہ بگوش پایا۔
میں نے عارف کے نور میں بہت سی تصویریں دیکھیں،
اور اسی نور میں مَیں نے اپنے محبوب کی تصویر بھی دیکھی۔
میرے دل کے اندر صدہا طلاطم پیدا ہوئے،
جب میں نے سمندر کو جوش و خروش کے عالم میں دیکھا۔
آسمان سے ہزاروں ہزار نعرے بلند ہوئے
کہ اے بندے تم ہمارے نقیب کی مانند ہو۔

Marfat.com

○

عشق است در آسمان بریدن

صد پرده بهر نفس دریدن

اول نفس از نفس گستن

آخر قدم از قدم بریدن

نادیده گرفتن این جهان را

مردیدهٔ خویش را ندیدن

زان سوئے نظر نظاره کردن

در کوچهٔ سیهنا دویدن

فلک کی جانب پرواز کرنا ہی دراصل عشق ہے

اور ہر ہر لحظہ سینکڑوں پردوں کو چاک کرنا ہوگا!

اولین لمحے زندگانی سے قطع تعلق کرنا ہوگا

پھر، لمحۂ آخریں میں قدم کے بغیر سفر طے کرنا ہوگا!

اس دنیا کو ایک غیر مرئی شے تصور کرنا ہوگا

اور اپنے وجود پر جو کچھ بھی عیاں ہو، اسے نہ دیکھنا ہوگا!

حدِّ نگاہ سے ماورا نظر ڈالنی ہوگی

اور آغوشِ (محبوب) کی لہروں میں سرایت کر جانا ہوگا!

Marfat.com

○

اے عاشقان اے عاشقان، ہنگام کوچست از جہان

در گوش جانم می رسد، طبلِ رحیل از آسمان

نک ساربان برخاستہ، قطارہا آراستہ

ازما حلالی خواستہ چہ خفتہ اید ای کاروان

این بانگھا از پیش و پس، بانگِ رحیلست و جرس

ہر لحظہ ای نفس نفس، سرمی کشد در لامکان

زین شمعھائے سرنگون، زین پردہ ہائے نیلگون

خلقی عجب آید برون، تا غیبہا گردد عیان

ای دل سوئے دلدار شو، ای یار سوئے یار شُو

اے پاسبان بیدار شو، خفتہ نشاید پاسبان

ہر سوی بانگ و مشغلہٗ ہر کوی شمع و مشغلہ

کامشب جہان حاملہ، زاید جہانِ جاودان

اے عاشقو! اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا سے کوچ کر جاؤ،
میرے کانوں میں آسمان سے طبلِ رحیل کی صدا آ رہی ہے!
وہ دیکھو! ساربان اٹھ کر اونٹوں کی قطار کو آراستہ کر رہا ہے،
اس نے باز پرس نہ کرنے کے لیے ہم سے قول و قرار کر لیا ہے!
پس و پیش سے جو صدائیں آ رہی ہیں وہ کارواں کی گھنٹیاں ہیں،
ہر ذی روح لحظہ بہ لحظہ لامکاں کی طرف مائلِ پرواز ہے!
یہ ساری سرنگوں شمعیں اور یہ سارے نیلگوں پردے،
عجیب خلقت کی صورت نمودار ہوئے ہیں تا کہ غیب عیاں ہو جائے!
اے دل اب جانبِ محبوب چل، اے دوست اپنے دوست کی جانب گامزن ہو،
اے پاسباں بیدار ہو جا کہ تیرے لیے خفتہ ہونا نازیبا ہے!
ہر طرف شور و غوغا اور ہنگامہ ہے، ہر کوچے میں قندیلیں روشن ہیں،
کہ آج کی رات یہ جہانِ حاملہ، جہانِ جاوداں کو جنم دے گا!

Marfat.com

○

چو نماز شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے
منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغائے
چو وضو ز اشک سازم بود آتش نمازم
در مسجدم بہ سوزد چو در رسد اذانے
عجباً نمازِ مستان تو بگو درست ہست آن
کہ نداند او زمانے نہ شناسد او مکانے
عجباً دو رکعت است این عجباً چہارم است این
عجباً چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے
در حق چگو نہ کویم کہ نہ دست ماند نے دل
دل و دست چون تو بردی بدہ اے خدا امانے
بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم
کہ تمام شد رکوعی کہ امام شد فلانے[1]

---

1 مذکورہ بالا غزل میں مولانائے روم نے اپنی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جو ادائیگی نماز کے دوران ان پر طاری ہوئی تھی۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ فارسی اور اُردو ادب میں غزل گوئی کو حسن و عشق کے جس محدود دائرے میں مقید کر دیا گیا تھا، مولانا نے اس روایت کو توڑ کر اس صنف سخن کو سینکڑوں سال پہلے ابدیت و انفرادیت عطا کر دی تھی۔

Marfat.com

نماز شام کے بعد جب شمعیں روشن کر دی جاتی ہیں اور مسند بچھا دی جاتی ہے،
اس وقت میں اپنے محبوب کے تصور میں حزن وغم وملال کے عالم میں کھویا رہتا ہوں!
میری نماز آتش کی مانند ہے اور میں اپنے اشکوں سے وضو کرتا ہوں،
اور جب اذان کی آواز سنائی دیتی ہے تو میری مسجد کا دروازہ آتش گیر ہو جاتا ہے!
مستوں (عاشقوں) کی نماز بھی عجیب وغریب نوعیت کی ہے،
آپ ہی بتایئے کہ کیا ایسی نماز درست ہے جس میں نہ زماں کی پابندی ہے نہ مکاں کی؟
یہ دو رکعتیں اور خصوصی طور پر چار رکعتیں عجیب وغریب نوعیت کی ہیں،
میں ان میں کوئی سورۃ اپنی زبان کو استعمال میں لائے بغیر ہی پڑھتا ہوں!
میں درِ حق پر کس طرح دستک دے سکتا ہوں کہ نہ میرے پاس اس کام کے لیے دل
گردہ ہے نہ ہاتھ،
یہ دونوں چیزیں اے خدا آپ نے مجھ سے لے لی ہیں لہٰذا مجھے امان دیں!
بخدا میں اس بات سے ذرہ برابر واقف نہیں ہوں،
کہ کس نے امامت کی ہے اور کب رکوع کیا گیا ہے!

Marfat.com

○

ہمرنگ جماعت شو تا لذتِ جان بینی
در کوی خرابات آ تا درد کشان بینی
در کش قدح سودا ھل تا نشوی رسوا
بربند دو چشم سر تا چشم نہان بینی
بکشائی دو دست خود گر میل کنار ستت
بشکن بتِ خاکی را تا روی بتان بینی
از بہر عجوزی را چندین چہ کشی کابین
و ز بہر سہ نان تا کی شمشیر و سنان بینی
شب یار ہمی گردد خشخاش مخور امشب
بربند دہان از خود تا طعم دہان بینی
نک ساقیٔ بے جوری در مجلس او دوری
در دور در آبنشین تا کی دوران بینی
این جاست ربا بنگر جانی دہ و صد بستان
گر گی و سگی کم کن تا مہرِ شبان بینی
گفتی کہ فلانے را ببرید زمن دشمن
رَو ترک فلانے کن تاہست فلان بینی

Marfat.com

خودکو جماعت کے ہم رنگ بناؤ تا کہ تم روح کی لذت حاصل کرسکو،

کوئے میخانے میں داخل ہو جاؤ تا کہ تم پکے شرابی کو دیکھ سکو۔

خواہشوں کے ساغر کو نچوڑ کر تم شرمندہ نہ ہو گے،

اور اپنے سر کی آنکھوں کو بند کر دو تا کہ تم پوشیدہ آنکھوں کو دیکھ سکو۔

اگر تم بغل گیر ہونے کے آرزومند ہو تو اپنے بازوؤں کو پھیلا دو،

خاکی بُت کو توڑ دو تا کہ تم نور مجسم کا چہرہ دیکھ سکو۔

ایک بوڑھی عورت کی خاطر اس قدر جہیز کا سامان کیوں کرتے ہو،

اور تین وقت کی روٹی کے لیے کب تک شمشیر وسناں کو دیکھو گے۔

ہر رات محبوب آتا ہے لہٰذا تم آج کی رات افیون نہ کھاؤ،

تم منہ میں کوئی نوالہ نہ لو تا کہ محبوب کے منہ کا ذائقہ چکھ سکو۔

دیکھو، ساقی ظالم نہیں ہے اور اس کے اردگرد ایک حلقہ ہے،

آؤ اور اس حلقے میں بیٹھ جاؤ، کب تک تم سرگرداں رہو گے۔

دیکھو، یہاں ایک سودے بازی ہے کہ ایک زندگی دے کر سو لے لو،

سگ وگرگ کا وطیرہ چھوڑ دو تا کہ گڈریے کی محبت پا سکو۔

تم نے کہا کہ دشمن تم سے ایک شخص کو چھین کر لے گیا،

جاؤ، اس شخص سے دست بردار ہو جاؤ تا کہ تم حصول خدا کی توقع کر سکو۔

Marfat.com

اندیشہ مکن الّا از خالقِ اندیشہ

اندیشۂ جان بہتر کاندیشۂ نان بینی

باوسعت ارض اللہ در حبس چہ خسپیدی

زاندیشہ گرہ کم کن تا شرحِ جنان بینی

خاموش شو از گفتن تا گفت بری باری

از جان و جہان بگزر تا جان جہان بینی

Marfat.com

فکر وخیال کے خالق کے سوا کسی چیز کا اندیشہ نہ کرو،

روح کی فکر روٹی دال کی فکر سے کہیں بہتر ہے۔

جب خدا کی زمین اتنی کشادہ ہے تو تم قید خانے میں کیوں پڑے سوتے ہو،

اپنے اندیشے کو ختم کرو تا کہ جنت کے حقائق معلوم کر سکو۔

گفتگو کرنے سے باز رہو تا کہ عقبیٰ میں گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل کر سکو،

حیات وکائنات سے بے نیاز ہو جاؤ تا کہ تم جانِ جہاں کا مشاہدہ کر سکو۔

Marfat.com

○

یکے گنجے پدید آمد ازیں دکانِ زرکوبی
زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی زہے خوبی[1]

○

ایدوست بدوستی قرینیم ترا
ھر جاکہ قدم نہی زمینیم ترا
در مذھب عاشقی روا کی باشد
عالم تو ببینیم و نہ ببینیم ترا

---

1 مذکورہ بالا شعر افکارِ رومی اور حیاتِ جلال کا ایک شہکار ہے۔ اس کی غنائیت، اس کی لے اور اس کی پرسوزی اپنی مثال آپ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا کی زندگی کے ایک تاریخی دور کی بہ حسن وخوبی نمائندگی ہو رہی ہے۔ اور وہ کچھ اس طرح: جب مولانائے روم کے مرشد طریقت لاپتہ ہو گئے اور اس مخلص مرید کی زندگی طوفانِ غم سے آشنا ہو گئی۔ شب و روز کا گزارنا خاصا مشکل ہو گیا۔ رومی دیوانہ وار قونیہ کی گلیوں میں ناچتے پھرتے تھے۔ معاً ان کے کان میں ایک مدھری آواز آئی۔ وہ ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ صدا دراصل ایک زرکوب کی دکان سے آ رہی تھی۔ وہ چاندی پر ہتھوڑی کی ضربیں لگا رہا تھا۔ اس آواز میں ایسی مدھر تان تھی کہ مولانائے روم پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ رقص کناں ہو گئے۔ زرکوب صلاح الدین نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اور پھر وہ مولانا کا حلقہ بگوش ہو گیا۔

Marfat.com

میں نے چاندی سونے کے ورق بنانے والے کی دکان میں ایک خزانہ حاصل کر لیا۔

کیا ہی خوب اس کی صورت ہے، کیا ہی عمدہ اس کے معنی و مفہوم ہیں اور کیا ہی اچھی اس کی دلبستگی ہے!

○○○

اے دوست! ہم دوستی میں تجھ سے قریب ہیں
جہاں کہیں تیرا قدم پڑتا ہے، ہم سر بسجود ہو جاتے ہیں
مذہب عاشقی میں یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے
کہ ہم ترے خالق کو تو دیکھیں اور تجھے نظر انداز کریں!

Marfat.com

○

پرورد نباز و نعمت آن دوست مرا
بردوخت مرقع از رگ و پوست مرا
تن خرقه و اندرِ او دلِ ماصوفی
عالم همه خانقاه و شیخ اوست مرا

○

○

علمے که ترا گره کشاید بطلب
زان پشِ که از تو جان برآید بطلب
آن نیست که هست می نماید بگذار
آن هست که نیست بنماید بطلب

Marfat.com

میرے دوست نے نہایت ناز و نعمت سے میری دیکھ بھال کی
اس نے میرے رگ و پوست سے میرا مرقع سی دیا
میرا بدن خرقہ کی مانند ہے اور اس کے اندر میرا دل صوفی کی طرح ہے
تمام عالم ایک خانقاہ کی مثال ہے اور وہ میرا رہنما ہے!

○○○

تو ایسا علم حاصل کر جو سربستہ راز کو کھول سکے
قبل اس کے کہ تیری زندگی کا اختتام ہو جائے
اس نیستی کو نظر انداز کر دے جو ہستی کی مانند نظر آتی ہے
اور اس ہستی کو تلاش کر جو نیستی دکھائی دیتی ہے!

Marfat.com

○

از کفر و ز اسلام برون صحرائیست

ما را بمیان آن فضا سودائیست

عارف چون بدان رسید سر بنهد

نه کفر نه اسلام نه آنجا جائیست

○

بر هر جائیکه سرنهم مسجود او است

برشش جهت و برون زشش معبود او است

باغ و گل و بلبل و سماع و شاهد

این جمله بهانه و همه مقصود او است

اسلام اور کفر کے آگے ایک صحرا ہے
ہم وہاں کی فضا پر فریفتہ ہیں
جب عارف وہاں پہنچتا ہے تو اپنا سرنگوں کر لیتا ہے
گویا اس جگہ نہ کفر ہے اور نہ اسلام!

○○○

میں جہاں کہیں بھی سر جھکاتا ہوں، اسی کے آگے سر بہ سجدہ ہوتا ہوں
چاہے چھ اطراف ہوں یا ان چھ سے بھی ماورا ہوں، وہاں وہی ایک ہے
باغ، گل، بلبل، سماع اور معشوق
یہ سب محض بہانہ ہیں اور اصل مقصود وہی ایک ہے!

○

در مذہب عاشقان قرارے دگر است
دین بادۂ ناب را خمارے دگر است
ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم
کارے دگر است و عشق کارے دگر است

Marfat.com

عاشقوں کے مذہب میں قرار نام کی چیز ہی اور ہے
اسی طرح شراب کا نشہ بھی ان کے لیے مختلف شے ہے
ہر وہ علم جو ہم مدرسے میں حاصل کرتے ہیں
وہ کام ہی کچھ اور ہے اور عشق چیز ہی کچھ اور ہے!

○

بشنو از نَے چوں حکایت می کند وز جدائیہا شکایت می کند

کز نیستاں تامرا ببریدہ اند از نفیرم مرد وزن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق تا بگویم شرح درد اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

من بہر جمعّیتے نالاں شدم جفت خوشحالان و بد حالاں شدم

ہر کسے از ظنِّ خود شد یار من وز درونِ من نہ جست اسرار من

سِرِّ من از نالۂ من دور نیست لیک چشم و گوش را آں نور نیست

تن زجان و جاں زتن مستور نیست لیک کس را دید جاں دستور نیست

آتش ست ایں بانگ نائے ونیست باد ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

آتشِ عشق ست کاندر نَے فتاد جوششِ عشق ست کاندر مَے فتاد

نَے حریف ہر کہ از یارے بُرید پردہایش پردہائے ما درید

ہمچو نَے زہرے و تریاقے کہ دید ہمچو نَے دمساز و مشتاقے کہ دید

نَے حدیثِ راہ پُر خوں می کند قصہ ہائے عشق مجنوں می کند

دو دہان داریم گویا ہمچو نَے یک دہان پنہان ست درلبہائے وے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے و ہوئے در فگندہ در سما

لیک داند ہر کہ اُو را منظر ست کایں فغانِ ایں سرے ہم زاں سرست

بانسری کی یہ حکایت بھی سنو　　اس کی فرقت کی شکایت بھی سنو
کاٹ کر جنگل سے جب لایا اسے　　سن کے نالے سب کے سب گریاں ہوئے
غم سے پارہ پارہ سینا چاہیے　　نالہ سننے کا قرینہ چاہیے
اپنے مرکز سے کوئی ہے دُور جب　　یاد آئے وصل کا ہر روز و شب
میں ہر اک مجمع میں روئی ہوں مدام　　درمیانِ خرّم و محزوں عوام
ہر کوئی اپنے مطابق یارِ من　　پر نہ جانے کوئی بھی اسرارِ من
راز میرا نالے کے اندر نہاں　　نُور چشم و گوش کو حاصل کہاں
جان و تن اک دوسرے کے آشنا　　روح کا لیکن ہے مشکل دیکھنا
آگ ہے آوازِ نَے، صر صر نہیں　　آگ سے خالی نہ پینے گا کہیں
بانسری میں آگ الفت کی لگی　　مے میں کیسی عشق کی تندی چھپی
سُر فراقِ یار میں ہمدم بنا　　دل کا پردہ راگ سے اس کے پھٹا
بانسری میں زہر بھی تریاق بھی　　بانسری دمساز بھی، مشتاق بھی
نَے سنائے قصہ راہِ پُرخطر　　یہ بتائے حالِ مجنوں پُر اثر
مثلِ نَے ہم کو بھی ہیں دو دو دہاں　　ایک مخفی اس کے لب کے درمیاں
رُخ ہے روتے منہ کا لیکن سوئے یار　　ہے فلک تک اس کی یہ آہ و پکار
آنکھ والا آشنائے راز ہے　　اُس سرے کی ہی تو یہ آواز ہے

Marfat.com

دمدمہ ایں نائے از دمہائے اوست   ہائے و ہوئے روح از ہیہائے اوست
گر نبودے نالۂ نَے را ثمر   نَے جہاں را پُر نہ کر دے از شکر
در غمِ ما روز ہا بیگاہ شد   روزہا با سوزہا ہمراہ شد
روزہا گر رفت گورو باک نیست   تو بماں اے آنکہ چونتو پاک نیست
در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام
بادہ در جوشش گدائے جوشِ ماست   چرخ در گردش اسیرِ ہوشِ ماست
بادہ از ما مست شدنے ما ازو   قالب از ما ہست شد نے ما ازو
بند بگسل باش آزاد اے پسر   چند باشی بند سیم و بندِ زر
گر بریزی بحر را در کوزۂ   چند گنجد قسمتِ یک روزۂ
کوزۂ چشم حریصاں پُر نہ شُد   تا صدف قانع نہ شد پُردر نہ شد
ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد   او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما   اے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما
جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد   کوہ در رقص آمد و چالاک شُد
سر پنہان ست اندر زیر و بم   فاش اگر گویم جہاں برہم زنم
آنچہ نَے می گوید اندر ایں دو باب   گر بگویم من جہان گرد و خراب
با لبِ دمسازِ خود گر جفتمے   ہمچو نَے من گفتنیہا گفتمے
ہر کہ اُو از ہم زبانے شُد جدا   بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا

پھونک سے اس کی ہے نَے میں جل ترنگ — اس کی تنبیہ سے صدائے رنگ برنگ
ہوتی گر فریاد نَے یہ رائیگاں — پُر نہ ہوتا شُکر سے سارا جہاں
غم میں دن برباد کتنے ہو گئے — جان و دل ناشاد کتنے ہو گئے
دن یونہی گزرے تو گزرے، فکر کیا — پاک ہے جو ذات اس کا آسرا
حالِ کامل، ناقصوں کو کیا پتا — مختصر سی بات کر، میں نے کہا
جوشِ بادہ ہے گدائے جوشِ ما — گردشِ چرخ ہے اسیر ہوشِ ما
بادہ ہم سے مست، ہم اس سے نہیں — قالب از ماہست، ہم اس سے نہیں
اے پسر، بندش کو توڑ آزاد ہو — قیدِ سیم و زر سے چھٹ کر شاد ہو
تو اگر کوزے میں دریا کو بھرے — ایک دن میں کتنا پانی دے سکے؟
کوزۂ چشمِ حریصاں نہ بھرا — سیپ قانع جب ہوا، موتی بنا
جامہ جس کا عشق سے گر چاک ہے — جملہ حرص و عیب سے وہ پاک ہے
اے مرے سودائے عشق رہ شادماں — ہے شفا تجھ سے طبیبِ مہرباں
نخوت و ناموس کی تُو ہی دوا — تو ہی جالینوس و افلاطونِ ما
عشق سے پہنچا فلک تک جسمِ خاک — کوہ رقصاں زیرِ عکس تابناک
بانسری کے زیرو بم میں سِرّ نہاں — فاش کردوں گر تو ہو برہم جہاں
جو بھی کہتی ہے یہ نَے دو باب میں — گر کہوں، آئے جہاں گرداب میں
ہوتی قربت جو لبِ دمساز کی — کہہ گزرتا بات میں سب راز کی
ہم زباں سے جو بھی بچھڑا ہے کبھی — بے نوا ہونے کی حسرت ہی رہی

Marfat.com

چونکہ گُل رفت و گلستان در گذشت　　نشنوی زین پس ز بلبل سر گذشت

نُور اُو دریُمن و یسرو تحت و فوق　　برسرو بر گردنم چوں تاج و طوق

عشق خواہد کایں سخن بیرون رود　　آئینہ ات غماز نبود چوں بود

آئینہ ات دانی چرا غماز نیست　　زانکہ زنگار از رخش ممتاز نیست

آئینہ کز زنگ و آلایش جداست　　پُر شعاعِ نورِ خورشیدِ خداست

رَو، تو زنگار از رُخِ او پاک کن　　بعدازان آں نُور را ادراک کن

ایں حقیقت را شنو از گوشِ دل　　تابرون آئی بکلّی زآب و گِل

فہم گر دارید جان را رہ دہید　　بعد ازان از شوق پا در رہ نہید

Marfat.com

پھول جب مرجھا گیا، گلشن نہاں سرگذشت بلبل کی سننا اب کہاں
نور اس کا دائیں بائیں، تحت و فوق گردن و سر میں ہے مثلِ تاج و طوق
عشق کی خواہش سخن ہو اب عیاں آئنہ تیرا یہ چاہے، ہو نہاں
آئنہ غمّاز کیوں ہوتا نہیں زنگ سے بے نور ہے تیری جبیں
آئنہ جو زنگ و آلائش سے پاک نورِ خورشیدِ خدا سے تابناک
جا تو اس کے رخ سے زنگ کو دُور کر بعد ازاں تو اکتسابِ نور کر
اس حقیقت کو سنو از گوشِ دل تاکہ تم پاؤ نجات از آب و گِل
روح کو دو راستہ گر ہو فہیم منتخب کر لو صراطِ مستقیم

Marfat.com

○

بشنوید اے دوستان ایں داستان خود حقیقت نقدِ حال ماست آن

بود شاہے در زمانے پیش ازیں مُلکِ دنیا بودش و ہم مُلک دیں

اتفاقاً شاہ روزے شُد سوار باخواصِ خویش از بہر شکار

بہر صیدے می شُد او برکوہ و دشت ناگہان در دام عشق او صید گشت

یک کنیزک دید اُو بر شاہ راہ شد غلام آن کنیزک جانِ شاہ

مرغ جانش در قفس چون در طپید داد مال و آن کنیزک را خرید

چوں خرید او را و بر خوردار شد آن کنیزک از قضا بیمار شد

شہ طبیبان جمع کرد از چپ وراست گفت جان ہر دو در دستِ شماست

جانِ من سہل ست و جانِ جانم اوست درد مند و خستہ ام درمانم اوست

ہر کہ درمان کرد مَرجانِ مرا بُرد گنجِ دُرُّ و مرجانِ مرا

جملہ گفتندش کہ جاں بازی کنیم فہم گرد آریم و انبازی کنیم

ہر یکے از ما مسیحِ عالم ست ہر الم را درکفِ ما مرہم ست

گر خدا خواہد نہ گفتند از بطر پس خدا بتمود شان عجز بشر

ہرچہ کردند از علاج و از دوا گشت رنج افزون و حاجت ناروا

آن کنیزک از مرض چوں موئے شُد چشمِ شاہ از اشک خون چون جوئے شد

چون قضا آید طبیب ابلہ شود آن دوا در نفع خود گمرہ شود

Marfat.com

دوستو، آؤ سنو یہ داستاں ہے ہمارے حال کی یہ ترجماں

اب سے پہلے تھا کہیں اک بادشاہ دین و دنیا دونوں کا وہ سربراہ

ایک دن وہ بادشاہ ہو کر سوار چل پڑا مع دوستاں بہر شکار

پھر رہا تھا صید کو جب ڈھونڈتا دامِ الفت میں معاً وہ پھنس گیا

راستے میں اس نے دیکھی اک کنیز شہہ بنا اس کا غلام، ایسی تھی چیز

مرغ جاں اس کا تڑپ کر رہ گیا دے کے مال و زر اسے آخر لیا

اتفاقاً ہو گئی بیمار وہ فائدہ پہنچانے سے لاچار وہ

شہ نے حکما کو بلا کر یہ کہا جان ہم دونوں کی محتاجِ شفا

یہ کنیز ہے اصل میں جانانِ من میں ہوں بیمار اور یہ درمان من

جس نے میری جان کا درماں کیا گنج موتی اور مرجاں لے گیا

بولے مل کر ہم کریں گے اب علاج رکھیں گے اک دوسرے کی ہم تو لاج

ہم میں ہر اک ہے مسیحائے زماں ہاتھ میں ہر درد کا درماں نہاں

تھا تکبّر ان کی باتوں میں چھپا نہ دیا ہر گز خدا کا واسطہ

جس قدر سب نے علاج اس کا کیا دن بدن لیکن مرض بڑھتا گیا

وہ کنیزک بال جیسی ہو گئی چشم شہہ سے جوئے خوں بہنے لگی

موت جب آئے معالج کیا کرے جاں کنی میں ہر دوا بیکار ہے

Marfat.com

شہ چون عجزآن طبیبان را بدید　　پا برہنہ جانبِ مسجد دوید

رفت در مسجد سوئے محراب شد　　سجدہ گاہ از اشکِ شاہ پُر آب شد

کاے کمینہ بخششت ملکِ جہاں　　من چہ گویم چوں تو می دانی نہاں

حالِ ما و این طبیبان سر بسر　　پیش لطف عام تو باشد ہدر

چوں برآورد از میان جاں خروش　　اندر آمد بحرِ بخشایش بجوش

درمیانِ گریہ خوابش در ربود　　دید در خواب اُو کہ پیرے رُو نمود

گفت اے شہ مژدہ حاجاتت رواست　　گر غریبے آمدت فردا۔ زماست

چونکہ آید او حکیم حاذق ست　　صادقش داں کو امین و صادق ست

در علاجش سحرِ مطلق را ببیں　　در مزاجش قدرت حق را ببیں

خفتہ بود ایں خواب دید آگاہ شد　　گشتہ مملوکِ کنیزک شاہ شد

بود اندر منظرہ شد منتظر　　تا بہ بیند آنچہ بنمودند سر

دید شخصے کاملے پُر مایۂ　　آفتابے درمیانے سایۂ

شہ چو پیشِ میہمانِ خویش رفت　　شاہ بود و لیک بس درویش رفت

دست و پیشانیش بوسیدن گرفت　　و ز مقام و راہ پُرسیدن گرفت

چوں گذشت آں مجلس و خوانِ کرم　　دستِ او بگرفت و برد اندر حرم

قصۂ رنجور و رنجوری بخواند　　بعد ازاں درپیشِ رنجورش نشاند

رنگِ رو و نبض و قارورہ بدید　　ہم علاماتش ہم اسبابش شنید

دید از زاریش کُو زارِ دل ست　　تن خوش ست و او گرفتار دل ست

Marfat.com

شہ نے حکماء کی جو دیکھی بے بسی　　دوڑ کر مسجد کی اس نے راہ لی

بادشاہ محراب کی جانب گیا　　سجدہ گاہ کو اشک سے پُر کر دیا

اے خدا یہ سلطنت بخشش تری　　تجھ سے پوشیدہ نہیں اک بات بھی

ہم کو جو لاحق ہوا ہے فکر و غم　　تیرے لطفِ عام سے ہو کالعدم

بادشاہ نے دل سے جب فریاد کی　　موج بخشش ہر سو دریا میں اٹھی

روتے روتے بادشاہ جب سو گیا　　چہرہ دیکھا خواب میں اک پیر کا

کہہ رہے تھے آرزو بر آئے گی　　کل ملے گا تجھ سے میرا آدمی

ہو گا وہ لاریب اک حاذق حکیم　　اس کو تم صادق سمجھنا اور فہیم

اس کا جادو کی طرح ہوگا علاج　　قدرتِ حق آشنا اس کا مزاج

دفعتاً جاگا وہ شاہِ پُروقار　　تھا جلالت کا لیے سر میں خُمار

آ کے بیٹھا منظرے میں منتظرِ　　تاکہ واضح خواب کا ہو جائے سرِّ

دیکھا آتے ایک پیکر پُر ہنر　　تھا اندھیرے میں وہ سورج سر بسر

شہ لپک کر سامنے اس کے گیا　　بن کے سائل اور فقیرِ بے نوا

دست و پیشانی کو وہ چوما کیا　　حال پوچھا پھر مقام و راہ کا

کھانا مہمانی کا اس کو جب دیا　　پھر وہ مہماں کو حرم میں لے گیا

حال سب بیمار کا شہ نے کہا　　سامنے مہماں کو پھر بٹھلا دیا

نبض و قارورہ و رخ دیکھا گیا　　جملہ اسبابِ مرض پوچھا گیا

راز اس پہ کھل گیا بیمار کا　　تھی نشانہ عشق کے آزار کا

Marfat.com

گفت اے شہ خلوتی کن خانہ را دُور کن ہم خویش و ہم بیگانہ را
کس ندارد گوش در دہلیز ہا تا پرسم از کنیزک چیز ہا
خانہ خالی کرد شاہ و شدبروں تا بخواند برکنیزک اُو فسون
خانہ خالی کرد و یک دیّار نِہ جُز طبیب و جز ہماں بیمار نِہ
نرم نرمک گفت شہر تو کجاست کہ علاجِ اہل ہر شہرے جداست
دست بر نبضش نہاد و یک بیک بازمی پُرسید از جور فلک
با حکیم او رازہا می گفت فاش از مقام و خواجگان و شہر تاش
سوئے قصہ گفتنش میداد گوش سوئے نبض و جُنبشش می داشت ہوش
نبض او برحال خود بد بے گزند تا پرسید از سمرقند چوقند
آہ سردے برکشید او ماہُرو آب از چشمش رواں شد ہمچو جُو
گفت بازرگانم آنجا آورید خواجۂ زرگرداں شہرم خرید
در برِ خود داشت ششماہ و فروخت چوں بگفت ایں زآتش غم برفروخت
نبض جست و روئے سرخش زرد شد کز سمرقندیِّ زرگر فرو شد
چوں ز رنجورآں حکیم ایں راز یافت اصلِ آں درد و بلا را بازیافت
گفت کوئے اوکدام است و گذر او سریل گفت و کوئے غاتفر
گفت آنگہ آں حکیم باصواب آں کنیزک راکہ رستی از عذاب
من غم تو میخورم تو غم مخور بر تو من مشفق ترم از صدپدر
بعدازاں برخاست عزم شاہ کرد شاہ را زاں ثمّنہ آگاہ کرد

پھر کہا اے شہ یہ گھر خالی کرو یاں کسی بندے کو بھی آنے نہ دو
بات کرنی ہے کنیزک سے مجھے نہ سنے کوئی وہ جو کچھ بھی کہے
چھوڑا گھر کو، بادشاہ باہر گیا افسوں پڑھنے کا اسے موقع دیا
ہر مکیں نے کر دیا خالی مکاں تھی مریضہ اور معالج بس وہاں
پھر معالج نے کنیزک سے کہا تو کہاں کی رہنے والی ہے، بتا
ہاتھ اس کی نبض پہ رکھے ہوئے پوچھتا تھا حال وہ بیمار سے
کہتی جاتی تھی سبھی کچھ نیک ذات شہر کی، آقا کی، ہر بستی کی بات
غور سے سنتا تھا وہ باتیں تمام نبض کی حرکت سے بھی واقف مدام
نبض جبکہ چلتی تھی مدھم سی چال پوچھ بیٹھا وہ سمرقند کا بھی حال
چاند سے مکھڑے نے ٹھنڈی آہ بھری جوئے اشک آنکھوں سے پھر بہنے لگی
بولی تاجر شہر میں لایا مجھے پھر خریدا مجھ کو اک سونار نے
چھ مہینے اپنے پہلو میں رکھا بیچ کر پھر مجھ کو چلتا کر دیا
ذکر جب سونار کا اک دم چھڑا چہرہ اس کا زرد ہو کر رہ گیا
پا گیا بوڑھا معالج رازِ دل سن لی اس نے آخرش آوازِ دل
پوچھا اس نے کوچہ و راہِ گزر رہ سریل اور نام کوچہ غاتفر
تب معالج نے کنیزک سے کہا اب رہائی کا ملا ہے راستا
میں ترا غم خوار ہوں تو غم نہ کر مہرباں ہوں تجھ پہ مثلِ سو پدر
پھر وہ پہنچا بادشاہ کے سامنے راز بھی بیمار کا کچھ کچھ سنائے

شاہ گفت اکنوں بگو تدبیر چسیت   در چنیں غم موجب تاخیر چسیت

گفت تدبیر آں بودؔ کان مرد را   حاضر آریم از پئے این درد را

قاصدے بفرست کاخبارش کندؔ   طالب ایں فضل و ایثارش کند

مرد زرگر رابخواں زاں شہر دُور   بازر و خلعت بدہ او را غرور

تاشود محبوبِ تو خوشدل بدو   گردد آساں اینہمہ مشکل بدو

چوں بہ بیند سیم و زر آں بے نوا   بہر زر گردد زخان وماں جدا

زر خرد را والہ و شیدا کند   خاصہ مفلس را کہ خوش رسوا کند

چونکہ سلطاں از حکیم آنرا شنیدؔ   پندِ او را از دل و جاں برگزید

پس فرستاد آں طرف یکدو رسول   حاذقان و کافیان و بس عدول

تا سمرقند آمدند آں دو امیر   پیش آں زرگر ز شاہنشہ بشیر

نک فلاں شہ از برائے زرگری   اختیارت کرد زیرا مہتری

اینک ایں خلعت بگیر و زر و سیم   چوں بیائی خاص باشی و ندیم

مرد مال و خلعتِ بسیار دید   غرہ شد از شہر و فرزنداں بُرید

اندر آمد شادمان در راہ مرد   بیخبر کاں شاہ قصد جانش کرد

اے شدہ اندر سفر با صد رضا   خود بپائے خویش تا سوء القضا

چون رسید ازراہ آن مرد غریب   اندر آوردش بہ پیش شہ طبیب

شاہ دید او را و بس تعظیم کرد   مخزن زر را بدو تسلیم کرد

پس بفرمودش کہ بر ساز و ز زر   از سوار و طوق و خلخال و کمر

Marfat.com

بادشہ بولا کہ کیا تدبیر ہے　　اب علاجِ غم میں کیا تاخیر ہے
پیر مرد بولا کہ زرگر کو بلائیں　　اس مریضہ کو اسے لا کر دکھائیں
ایک قاصد بھیج کر بلوایئے　　زر کا بھی لالچ اسے دلوایئے
بھیجئے نقد اور خلعت برملا　　شہر چھوڑے اس کی فطرت برملا
دیکھ کر زرگر کو خوش ہو جائے گی　　آپ کی محبوبہ صحّت پائے گی
وہ سمرقندی جو دیکھے گا یہ زر　　اس کی خاطر چھوڑ دے گا اپنا گھر
عقل کو زر اپنا گرویدہ کرے　　مفلسوں کو یہ سدا رسوا کرے
جب معالج کی سنی شہ نے یہ بات　　صدقِ دل سے مان لی شہ نے یہ بات
پھر روانہ کر دیئے قاصد دو ایک　　کار ساز و ماہر و سر تا پا نیک
پہنچے بالآخر سمرقند وہ امیر　　آئے زرگر کے قریں شہہ کے سفیر
تجھ کو اک شہ نے برائے زرگری　　چُن لیا سُن کر تری کاریگری
لے یہ خلعت، یہ جواہر اور سیم　　آئے گا جب شہہ کا تو ہو گا ندیم
دیکھا اس نے خلعت و زر اس قدر　　چھوڑا اس نے شہر و فرزند اور گھر
مرد خوش خوش سوئے سلطاں چل پڑا　　بے خبر کہ جان کا سودا یہ تھا
کر رہا تھا وہ سفر باصد رضا　　تھا نہ واقف راستہ ہے موت کا
جب مسافر منزلیں طے کر چکا　　سامنے سلطاں کے وہ لایا گیا
شہ نے اس کو دیکھ کر تعظیم کی　　زر جواہر دے کے خوب تکریم کی
پھر کہا سونے سے کچھ زیور بنا　　ہم کو تو اپنا ہنر زرگر دکھا

Marfat.com

زر گرفت آں مردو شد مشغول کار　　بے خبر از حالتِ ایں کار زار

پس حکیمش گفت کایے سلطانِ مہ　　آں کنیزک را بایں خواجہ بدہ

تا کنیزک در وصالش خوش شود　　آبِ وصلش دفع ایں آتش شود

شہ بدو بخشید آں مہ روئے را　　جفت کرد آں ہر دو صحبت جوئے را

مدتِ ششماہ میراندندِ کام　　تابصحت آمد آں دختر تمام

بعدازاں ازبہر اُو شربت بساخت　　تابخورد و پیش دختر می گداخت

چوں ز رنجوری جمالِ او نماند　　جان دختر در وبال او نماند

چونکہ زشت و ناخوش و رخ زرد شد　　اندک اندک در دلِ اُو سرد شد

عشقہائے کز پئے رنگے بود

عشق نبوَد عاقبت ننگے بود

Marfat.com

سونا لے کر لگ گیا وہ کام میں　　بے خبر کہ پھنس چکا ہے دام میں
پھر معالج نے یہ سلطاں سے کہا　　کر دیں زرگر کو کنیزک یہ عطا
نکلے گی وہ آگ کے گرداب سے　　ہوگی اچھی وصل کے برفاب سے
شہ نے اس کی مان لی آخر صلاح　　کر دیا دونوں کا اس نے پھر نکاح
چھ مہینے دونوں ہم آغوش تھے　　وصل کی لذت سے وہ مدہوش تھے
ہو گئی آخر بھلی چنگی کنیز　　بن گئی وہ حسن کی دلکش سی چیز
پھر معالج نے بنائی اک دوا　　اس کا شربت کی طرح تھا ذائقہ
وہ سمرقندی اسے پیتا مدام　　گھلتا جاتا اثر بد سے صبح و شام
پھر جوانی بالکل ہی جاتی رہی　　لحظہ لحظہ مردنی چھاتی رہی
ہڈی کا سوکھا سا ڈھانچہ بن گیا　　بدنما سا ایک کھانچا بن گیا
چاہ لڑکی کو نہ اس سے اب رہی　　رفتہ رفتہ آگ الفت کی بجھی
عشق جو ہوتا ہے بہرِ رنگ و بُو
کرتا ہے آخر میں رسوا کُو بہ کُو

Marfat.com

○

ہم ز ابراہیم ادہم آمدست کو ز راہے برلب دریا نشست

دلق خود می دوخت آں سلطانِ جاں یک امیرے آمد آنجا ناگہاں

آں امیر از بندگانِ شیخ بود شیخ را بشناخت سجدہ کرد زود

شکلِ دیگر گشت خُلق و خلق او خیرہ شد در شیخ و اندر دلق او

کو رہا کرد آنچناں ملک شگرف برگزید ایں فقر و بس باریک حرف

ترک کرد اُو ملکِ ہفت اقلیم را می زند بر دلق سوزن چوں گدا

ملکِ ہفت اقلیم ضائع می کُند چوں گدا بر دلق سوزن می زند

شیخ واقف گشت از اندیشہ اش شیخ چوں شیرست و دلہا بیشہ اش

شیخ سُوزن زود در دریا فگند خواست سوزن را بآواز بلند

صد ہزاران ماہیٔ اللّٰہیے سُوزنِ زر بر لب ہر ماہیئے

گفت الٰہی سوزنِ خود خواستم دادہ از فضلت نشانِ راستم

ماہیئے دیگر برآمد در زماں سوزنِ اُو را گرفتہ در دہاں

رو بدو کردد بگفتش اے امیر

ملکِ دل بہ یا چناں ملک حقیر

Marfat.com

حضرتِ ادہم کا ہے یہ واقعہ سُن کے ہوتا ہے ہر اک حیرت زدہ
آپ دریا کے کنارے بیٹھ کر اپنی گڈری سی رہے تھے بے خبر
ناگہاں سردار اک آیا وہاں اس نے آنکھوں سے جو دیکھا یہ سماں
ہو گیا حیران و ششدر وہ امیر ملک ہفت اقلیم کا شہ اور فقیر؟
وہ غلاموں میں ادہم کے تھا کبھی کاسہ لیسوں میں ادہم کے تھا کبھی
بلخ کی کیوں چھوڑ دی ہے سلطنت ترک کیوں کی عز و شان و تمکنت
اف کہ گڈری سی رہے ہیں بادشاہ بے بسی سے جی رہے ہیں بادشاہ
آپ پر واضح ہوا اس کا خیال دل پہ روشن ہو گیا اس کا ملال
شیخ نے دریا میں سوئی پھینک دی پھر بہ آواز بلند درخواست کی
سوئی جو پھینکی ہے لوٹا دے مجھے میری اپنی چیز پہنچا دے مجھے
ابھریں پانی پر ہزاروں مچھلیاں ان کے منہ میں تھیں سنہری سوئیاں
آپ بولے یہ مری سوئی نہیں میں نے دریا میں تو یہ پھینکی نہیں
مجھ کو بس اپنی ہی سوئی چاہیے جو کہ میں نے ہے ڈبوئی، چاہیئے
فوراً ہی اک ننھی مچھلی آ گئی منہ میں لے کر اصلی سوئی آپ کی

پھر کہا یہ آپ نے سردار سے
''یہ ہے میری بادشاہت، دیکھ لے''

Marfat.com

○

دید موسیٰؑ یک شبانے را براہ　　کو ہمی گفت اے کریم و اے اِلٰہ

تو کجائی تا شوم من چاکرت　　چا رُقت دوزم کنم شانہ سرت

تو کجائی تاکہ خدمتہا کنم　　جامہ ات را دوزم و بخیہ زنم

جامہ ات شویم سپشہایت کشم　　شِیر پیشت آورم اے محتشم

ور ترا بیماریِ آمد بہ پیش　　من ترا غم خوار باشم ہمچو خویش

دستکت بوسم بمالم پایکت　　وقت خواب آید بروبم جائیکت

اے خدائے من فدایت جانِ من　　جملہ فرزندان و خان و مانِ من

گربدانم خانۂ تو من مُدام　　شِیر و روغن آرمت ہر صبح و شام

ہم پنیر و نانہائے روغنیں　　خمّ ہائے جوغرات اے نازنیں

اے فدائے تو ہمہ بُزہائے من　　وے بیادت ہی ہی وہیہائے من

زیں نمط بیہودہ می گفت آں شباں　　گفت موسیٰ باکیستت اے فلاں

گفت باآں کس کہ مارا آفرید　　ایں زمین و چرخ ازو آمد پدید

گفت موسیٰؑ ہائے خیرہ سرشدی　　خود مسلماں ناشدہ کافر شدی

اینچہ ژاژت و اینچہ کفرست و فُشار　　پنبۂ اندر دہان خود فَشار

گرنہ بندی زین سخن توحلق را　　آتشے آمد بسوزد خلق را

گفت اے موسیٰؑ دہانم دوختی　　وز پشیمانی تو جانم سوختی

Marfat.com

دیکھا موسیٰؑ نے گڈریا راہ میں بات کرتا تھا خدا کی چاہ میں

تو کہاں ہے؟ میں ترا نوکر بنوں جوتا سی دوں سر میں کنگھی بھی کروں

تو کہاں ہے؟ میں تری خدمت کروں کپڑا سی دوں، میں تری عزت کروں

کپڑے دھوؤں، جوئیں تیری مار دوں تیرے آگے دودھ کا پیالہ رکھوں

تو اگر بیمار پڑ جائے کبھی میں کروں تیمارداری بھی تری

ہاتھ چوموں، پیر دابوں میں ترا رات ہوتے ہی لگا دوں بسترا

اے خدا یہ میری جاں تجھ پہ نثار جملہ فرزند و مکاں تجھ پہ نثار

تیرے گھر کا مجھ کو چل جائے پتا دودھ گھی پہنچاؤں میں صبح و مسا

میں پنیر اور روٹی لاؤں روغنی پیش کردوں تجھ کو لا کر میں دہی

اے کہ تجھ پہ بکریاں میری فدا یاد میں تیری ہے یہ آہ و بکا

بات بیہودہ وہ کرتا تھا مدام تھی نہ اس کے منہ میں کوئی لگام

بولے موسیٰؑ کس سے تو کرتا ہے بات بولا خالق سے کہ اعلیٰ جس کی ذات

جس نے پیدا کر دیا سارا جہاں مہر و ماہ اور یہ زمین و آسماں

بولے موسیٰؑ ہائے تو پاگل ہے کیا تو مسلماں ہو کے اک کافر بنا

کیسی ہے بکواس اور بے ہودگی اپنے منہ میں ٹھونس لے ظالم روئی

اب بھی تو نے منہ نہ اپنا بند کیا آگ آ کردے گی دنیا کو جلا

قول موسیٰؑ کا گڈریے نے سنا شرم سے وہ پانی پانی ہو گیا

Marfat.com

جامہ را بدرید و آہے کرد تفت سر نہاد اندر بیابان و برفت
وحی آمد سوئے موسیٰؑ از خدا بندۂ ما را ز ما کردی جدا

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

Marfat.com

کپڑے پھاڑے اور اس نے آہ کی خامشی سے جنگلوں کی راہ لی
حضرتِ موسیٰؑ پہ آئی پھر وحی بندہ و آقا میں ڈالی ہے جدائی
"تجھ کو بھیجا ہے ملانے کے لیے
نہ کہ بندوں سے چھڑانے کے لیے"

Marfat.com

○

بود بقّالے مَر اُو را طوطیئے خوش نوا و سبز و گویا طوطیئے
بر دکاں بودے نگہبانِ دُکاں نکتہ گفتے باہمہ سوداگراں
خواجہ روزے سوئے خانہ رفتہ بُود در دکاں طوطی نگہبانی نمود
گربۂ برجست ناگہ در دکاں بہر موشے، طوطیک از بیم جاں
جست از صدرِ دکاں بہر گریخت شیشہ ہائے روغنِ گل را بریخت
از سوئے خانہ بیامد خواجہ اش بر دکاں بنشست فارغ شاد و خوش
دید پُر روغن دکان و جامہ چرب بر سرش زد گشت طوطی کل ز ضرب
روز کے چندے سخن کوتاہ کرد مرد بقّال از ندامت آہ کرد
ریش بر می کند و می گفت اے وریغ کافتاب نعمتم شد زیرِ میغ
دست من بشکستہ بودے آں زماں کہ زدم من برسر آں خوش زباں
ہدیہ ہا می داد ہر درویش را تا بیابد نطقِ مرغ خویش را
بعدسہ روز و سہ شب حیران و زار بر دکاں نبشستہ بد نومیدوار
باہزاراں غصہ و غم گشتہ جفت کاے عجب ایں مرغ کے آید بگفت
می نمود آں مُرغ را ہر گوں شگفت وز تعجب لب بدنداں می گرفت
دم بہ دم می گفت با اُو ہر سخن تا کہ باشد کاندر آید در سخن

Marfat.com

ایک طوطی تھی کسی بنئے کے پاس خوش نوا تھی، سبز اس کا تھا لباس
اصل میں تھی وہ نگہبانِ دکاں بات کرتی، آتے جب سوداگراں
ایک دن مالک گیا تھا اپنے گھر تھی محافظ وہ دکاں کی سر بہ سر
ایک بلّی کود کر آئی وہاں نکلی جاتی خوف سے طوطی کی جاں
ایک چوہے کو پکڑنے کے لیے وہ دکاں میں ہر طرف دوڑی پھرے
اس نے ٹکر سے گرا دیں شیشیاں روغنِ گل کی بہا دیں شیشیاں
آیا گھر سے جبکہ بقّالہ وہاں دیکھا بربادی کا ہر سو اک سماں
طوطی کی غفلت کا یوں بدلہ لیا سر پہ مارا اس کو گنجا کر دیا
طوطی نے پھر بات کرنی چھوڑ دی ہو کے نادم بنئے نے اک آہ کی
خود کو کرتا تھا ملامت ہر گھڑی اس کو ہوتی تھی خجالت ہر گھڑی
کاش طوطی کو نہ میں یوں مارتا غصّے میں آ کر نہ یوں دُھتکارتا
اپنی داڑھی وہ یہ کہہ کر نوچتا آہ نعمت کا وہ سورج چھپ گیا
ٹوٹ جاتا کاش میرا ہاتھ یہ گنجا کرنے میں نہ دیتا ساتھ یہ
تحفہ درویشوں کو وہ دیتا رہا تاکہ طوطی کے لیے مانگیں دعا
تین دن گزرے کہ بقّالہ غریب سوچتا تھا بات کیسی ہے عجیب
تھا ہزاروں رنج میں وہ مبتلا کب میں دیکھوں اس کو فرفر بولتا
رنگ برنگی شئے دکھاتا تھا اسے کھیل کرتب سے لبھاتا تھا اُسے
بات کرتا رہتا تھا طوطی سے وہ قصّہ کہتا جاتا تھا طوطی سے وہ
پر نہ طوطی بولتی تھی کوئی بات چُپ رہا کرتی وہ دن ہو یا کہ رات

Marfat.com

ناگہانی جولقیِ می گذشت باسرِ بے مُو چو پشتِ طاس و طشت

طوطی اندر گفت آمد آں زماں بانگ بر رویش زدہ چوں عاقلاں

کزچہ اے کل باکلاں آمیختی تو مگر از شیشہ روغن ریختی

Marfat.com

اتفاقاً واں سے گزرا راہ گیر　　وہ تھا کمبل کو لپیٹے اک فقیر
اس کا سر تھا یا کہ چکنا تھال تھا　　اس کے چندیے پر نہ اک بھی بال تھا
گویا بالکل ہی وہ گنجا تھا فقیر　　صاف آتی تھی نظر سر کی لکیر
طوطی اس کو دیکھتے ہی بول اٹھی　　اس نے گڈری پوش کو آواز دی
عاقلوں کی طرح پوچھا پھر سوال　　سُن کے سب ہنسنے لگے ہو کر بے حال
گنجے! تو گنجوں میں کیوں شامل ہوا
تجھ سے بھی کیا روغنِ گُل بہہ گیا

Marfat.com

Marfat.com

اختتامیہ

وہ ربیع الاول 1428ھ کی 13 اور اپریل 2007ء کی 2 تاریخ تھی۔ میں ایک دن قبل ہی قلندرِ زماں شہزادہ اسدالرحمٰن قدسیؒ کی تقریب سالگرہ میں شرکت کر کے آستانۂ مبارک (بھون) سے واپس آیا تھا۔ صبح 8 بجے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی چلا گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میرے استاذی المحترم اور سلسلۂ نقشبندیہ کے رکن رکین ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان مرحوم کے پوتے اور حضرت کے سجادہ نشین جناب ڈاکٹر حافظ منیر احمد صاحب کا فون آیا۔ کہہ رہے تھے:

''اس مرتبہ بھی حکومت پاکستان نے بارہ ربیع الاول کی پُروقار تقریب میں شرکت کے لیے مجھے مدعو کیا تھا۔ آج میں اسلام آباد ہی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ مغرب بعد، سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں ذکر اور مراقبے کی روحانی مجلس منعقد ہو گی۔ گزشتہ سال بھی آپ اور چچی (میری اہلیہ) دونوں وہاں تشریف لائے تھے۔ آج ضرور آیئے۔ میں نے چچی سے بھی فون پر گفتگو کی ہے۔''

جب ساڑھے تین بجے یونیورسٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو میری اہلیہ (سیّدہ ملیحہ بلخی) میرا انتظار کر رہی تھیں۔ پھر ہم دونوں نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ انہوں نے درمیانِ طعام حافظ

منیر احمد صاحب کے دعوت نامے کا ذکر کیا۔ کہنے لگیں:

''شامی (بیٹا) اور رابعہ (بہو) عمان میں ہیں۔ شیما (بیٹی) بھی دوبئ میں ہے۔ نغمہ (بڑی بیٹی) قطر میں اور فارحہ (چھوٹی بیٹی) جی 9 (اسلام آباد) میں اپنے اپنے گھروں میں ماشاءاللہ آباد ہیں۔ ایک بیٹا سعدی ہے۔ اسے ہی گاڑی چلانی آتی ہے۔ مگر وہ جیو سے رات آٹھ نو بجے تک آئے گا۔ اسی کو حافظ منیر صاحب کی رہائش کا پتہ ہے اور آپ کو نہ تو گاڑی چلانی آتی ہے اور نہ پتہ ہی یاد رہتا ہے۔ ذکر اور مراقبے کی مجلس میں مغرب تک جانا بہت مشکل ہے۔ اور پھر رات کھانے پر ہم تینوں فارحہ کے یہاں مدعو بھی ہیں۔ لگتا ہے پنڈی جا کر مراقبے اور ذکر میں شرکت کرنا مشکل ہے۔''

ابھی ہم دونوں کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اہلیہ کی ملنے والی ایک پڑوسن (انجم) کچھ میٹھی چیزیں پکا کر لے آئی تھیں۔ پھر کہنے لگیں کہ ''انکل! کوئی روحانی واقعہ سنایئے۔'' میں نے اسی رات مولانا جلال الدین رومیؒ کی اہلیہ کرا خاتون کا بیان کردہ ایک واقعہ زیرِ نظر کتاب کے لیے لکھا تھا۔ میں نے وہی انجم کو سنایا اور کچھ اس طرح:

جب حضرت شمس تبریزی اپنے مرشد بابا کمال جندی کے حکم سے قونیہ آئے تا کہ روحانی گرمی سے جوان رومی کو گرم کر دیں۔ اس وقت مولانا کا بڑا بول بالا تھا۔ بحیثیت صدر مدرس، بلحاظِ مفتی، بہ سببِ عالم دین وہ پورے علاقے میں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دنیاوی جاہ و حشمت اور مال و منال بھی میسر تھا۔ مگر شمس تبریزی سے ملاقات کے بعد سوائے بوریائے بوذر اور گوشۂ تنہائی کے کچھ بھی نہ تھا۔ گھر کی وہ حالتِ ماضی برقرار نہ رہی۔ مولانا ہمہ وقت بند کمرے میں شمس تبریزی کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ اُن کی اہلیہ کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ آخر یہ دونوں کمرے میں مقید ہو کر کرتے کیا ہیں؟

چنانچہ نصف شب کو وہ دبے قدموں اس کمرے کے دروازے پر آئیں جہاں مولانائے روم اور حضرت شمس تبریزی گوشہ نشیں تھے۔ دروازے میں ایک سوراخ تھا۔ اس سے جھانک کر

Marfat.com

کِرا خاتون نے دیکھا:

مولانا اوران کے روحانی پیشوا جانماز پر بیٹھے مراقبے میں ہیں اور ذکر کر رہے ہیں۔ پھرانہوں نے تہجد کی نمازیں پڑھیں۔معاً سامنے کی دیوار پھٹی اورنورانی شکل وصورت کے چھ افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ان میں جوآگے تھے، ان کے ہاتھ میں پھولوں کا بہت بڑا گلدستہ تھا۔انہوں نے یہ شمس تبریز کو دیا۔آں بزرگ نے مولانا کو تھما دیا۔انہوں نے اسے طاقچے پر رکھ دیا۔

پھر یہ دونوں..... چھ نو واردوں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے اور ذکر و مراقبے میں مصروف ہو گئے، یہاں تک کہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔آٹھوں افراد کھڑے ہوئے۔نو واردوں نے حضرت شمس سے امامت کرنے کی درخواست کی۔انہوں نے انکار کر دیا اور مولانا کو حکم دیا کہ نماز پڑھاؤ۔چنانچہ وہ آگے بڑھے۔نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ نماز پڑھائی۔

میں نے پہلے کبھی اس طرح اپنے شوہر کو امامت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ان کی قرأت اتنی رقت آمیز تھی کہ میں رونے لگی۔

نماز سے فراغت کے بعد چھ کے چھ نو وارد نورانی افراد واپس چلے گئے اور دیوار برابر ہو گئی۔کچھ دیر بعد مولانا پھولوں کا وہی گلدستہ ہاتھوں میں لیے اندرونِ حویلی آئے اور مجھے یہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ''اس گلدستے کا خیال رکھنا۔یہ جنت کے پھول ہیں۔

ooo

یہ واقعہ سن کر میری اہلیہ اورانجم دونوں کی آنکھیں پُرتھیں۔رات 9 بجے سعدی میاں جیو سے واپس گھر آئے تو ہم تینوں اپنی بیٹی فارحہ کے گھر کھانے پر چلے گئے۔11:30 بجے واپسی ہوئی۔اہلیہ اُدھر عبادت میں مصروف ہو گئیں اور اِدھر میں مولانائے روم والی اس کتاب کے کچھ

جزو لکھنے بیٹھ گیا۔

رات کے ٹھیک دو بجے میرے بیٹے سعدی نے مجھے جگایا کہ امّی کی حالت بگڑ رہی ہے۔ میں بھاگ کر ان کے پاس آیا۔ دل میں تکلیف ہو رہی تھی۔ سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر اپنی کنپٹی پر رکھ رہی تھیں..... پھر انہوں نے اپنی انگوٹھی اتار کر بستر پر رکھ دی۔ کلمہ کا ورد کرنے لگیں۔ سورہ یٰسٓ پڑھنے لگیں..... سب لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان سبھوں کو کلمہ پڑھنے کی تاکید کر رہی تھیں۔ ہسپتال جانا نہیں چاہتی تھیں اور نہ ونٹی لیٹر لگوانا پسند کرتی تھیں۔ بہر حال، بچوں کے اصرار پر گاڑی میں بیٹھیں۔ پمز ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اپنی بیٹی فارحہ کی گود میں دَم توڑ گئیں۔ اناللہ.....

حافظ قاری محمود جنہیں وہ اپنا بیٹا کہتی تھیں، وہ اپنے گاؤں اٹک گئے ہوئے تھے۔ وہاں انہوں نے خواب میں دیکھا:

> ''اماں جی ایک محل کے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ بہت نورانی تھا۔ کہنے لگیں کہ بیٹا اندر آ جاؤ۔ یہ میرا محل ہے۔ اللہ نے مجھ کو بخش دیا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کا بہت بڑا گلدستہ تھا، یعنی جنت کے پھول!''

روحانی تعلق بھی خوب ہوتا ہے۔ میں نے سہ پہر میں کراخاتون والا واقعہ اہلیہ اور انجم دونوں کو سنایا تھا۔ چند ہی گھنٹوں بعد میری رفیق زندگی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ راہیٔ ملک عدم ہو گئیں۔ مذکورہ واقعہ میں ''ذکر'' اور ''مراقبے'' کا تذکرہ تھا۔ پھر پھولوں کے بہت بڑے گلدستے کا! اسی رات سلسلۂ نقشبندیہ کے سجادہ نشیں حافظ منیر احمد صاحب میری اہلیہ کو خصوصی طور پر ذکر اور مراقبے میں بلا رہے تھے۔ اس کی تجدید کراخاتون کے سنائے ہوئے واقعے سے ہو گئی..... پھر چھ نورانی بزرگوں کا لایا ہوا گلدستہ!..... اس کی تصدیق حافظ قاری محمود صاحب کے دیکھے ہوئے اس خواب سے ہو گئی۔

جب میں نے غور کیا تو بات اپنائیت کی نکلی۔ میری اہلیہ سیدہ ملیحہ بلخی حضرت ابراہیم ادہمؒ

Marfat.com

کے خاندان سے تھیں اور مولانا جلال الدین رومی کی والدہ بھی اس خانوادۂ مقدس کا ایک فرد تھیں۔ مماثلت تو ہونی تھی، فیض تو پہنچنا تھا اور اکتسابِ نُور تو لازمی تھا..... سو یہ سب مولانائے روم کی اعلیٰ و افضل روحانیت کا ہی ثمرہ تھا کہ کہاں بلخ، کہاں قونیہ اور کہاں اسلام آباد واٹک!

بُعدِ منزل نہ شود در سفر روحانی

محمود الرحمٰن

Marfat.com

Marfat.com

کتابیات

اُردو کتب

1- احمد الافلاکی : مناقب العارفین ومراۃ کاشفین، تہران

2- احسان الحق : اصول تنقید، لاہور، س ن

3- بشیر محمود اختر (مترجم) : مولانا رومی، حیات وافکار، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور 1979ء

4- بدیع الزماں فروزاں فر : سوانح مولوی، تہران، 1325

5- خلیفہ عبدالحکیم : حکمتِ رومی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1955ء

6- ایضاً : تشبیہات رومی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، 1959ء

7- رضازادہ شفق : تاریخ ادبیات ایران، تہران، 1312

8- شبلی نعمانی : سوانح مولانا روم، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1979ء

9- غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر : اوراق گم گشتہ، حیدرآباد (سندھ)، 1997ء

10- مولانائے روم : کلیات دیوان شمس تبریزی، مطبع نولکشور، لکھنؤ، دفتر اول تا ششم، س ن

11- محمد صدیق خیرآبادی : دانش کدہ، لاہور، 1960ء

12- محمد اکرم، ڈاکٹر : کلام اقبال میں تاریخی شخصیات اور ان کے ساتھ اقبال کے ذہنی روابط، تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی، 2004ء

13- قاسم صافی، ڈاکٹر : انسان کی ہدایت میں رومی کا کردار، مطبوعہ پیغام آشنا، اسلام آباد، شمارہ 19، 2004ء

14- اُردہ دائرہ معارف اسلامیہ : جلد 7، دانش گاہ پنجاب، لاہور، 1973ء

انگریزی کتب

15. Capt. W.B.S. Rabbani : Islamic Sufims, The science of flight in God, with God, by God and union & communion with God, Lahore, 1984

16. E.H. Whinfield : Rumi, London, 1887

17. E.G. Brown : A Literary History of Persia, London, 1902

18. Chittick, William C : The Sufi Doctrine of Rumi, Tehran, 1974

19. David, Hadland : Rumi, The Persian Mystic, Lahore, n.d.

20. Nicholson, R.A : Mathnawi of Jalaluddin Rumi, Translation & commentary, Lahore, 1989

21. ---------- : Rumi, Poet & Mystic. Lahore, 1956

22. Jonathan Star : Rumi, New York, 1977.

23. Coleman Barks : The Essential Rumi, New Jersey, 1995.

24. Encyelopaedia Britanniea, : Vol. V, 15ed, Chicago. 1943-1973

25. Mahmudur Rehman : Prominent Personalities of the Muslim World, Islamabad, 1993

Marfat.com

مولانا جلال الدین رومی

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

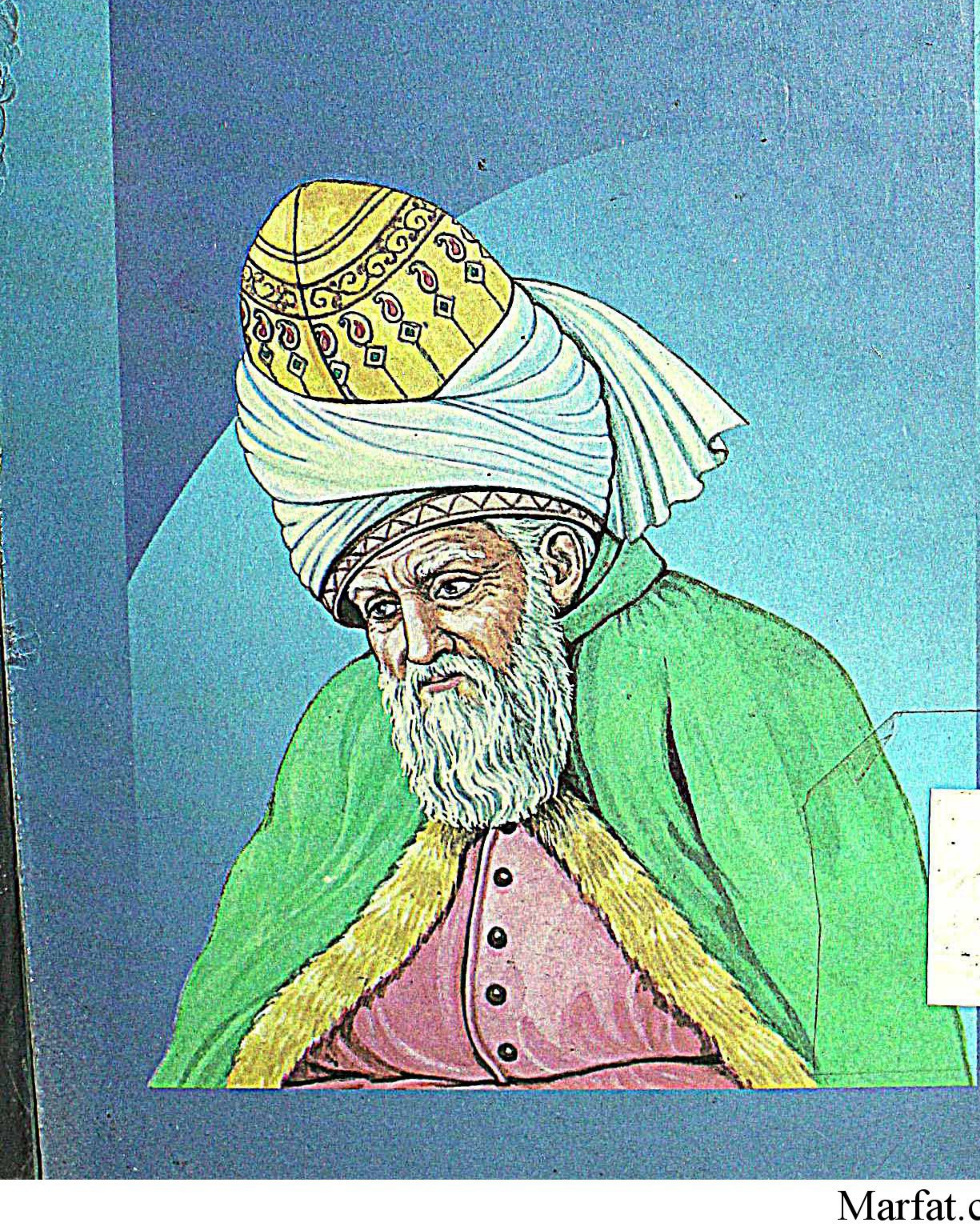

Marfat.com